کلیات

اختر شیرانی

مرتبہ

گوپال متل

کلّیاتِ اختر شیرانی

کلّیاتِ اخترؔ شیرانی

مرتّب

گوپال مِتّل

ناشر

نیشنل اکاڈمی، ۹ انصاری مارکیٹ، دہلی ۶

پہلی بار

اپریل ۱۹۶۹ء

قیمت

چھ روپے

(مطبوعہ یونین پرنٹنگ پریس، دہلی)

کہو زاہد سے کیوں ہے اس قدر فردوس پہ نازاں
ہزاروں جنّتیں آباد ہیں تخئیلِ اختر میں

(آغا حشر)

فہرست

٥

اختر شیرانی

اختر شیرانی کی موت کو اکیس ۲۱ سال ہونے کو ہیں۔ ۹ ستمبر ۱۹۴۸ء کو وہ اپنی سلماؤں اور عذراؤں کی تلاش میں کسی نامعلوم وادی کی طرف نکل گیا۔ لوگوں نے اس کی زندگی میں سلمیٰ اور عذرا کو شخص کرنے کی کوشش کی تھی اور بعض کا تو خیال تھا کہ انھوں نے ایک مشہور ادیبہ میں ان کا سراغ لگا بھی لیا ہے لیکن یہ سب خیال آرائی تھی۔ سلمیٰ اور عذرا اختر کے رومانی افکار کے ہیولے تھے۔ ان کا پرتو کسی عورت میں اسے نظر آ گیا ہو تو اور بات ہے لیکن یہ ہیولے پوری طرح متشکل کبھی نہیں ہو سکے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو اس کا رومانی عشق سدا بہار نہیں رہ سکتا تھا۔

اختر کا دعویٰ تھا کہ اس کی شاعری تصوّف سے پاک ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار میں نے اس کے کلام سے ایک متصوفانہ شعر ڈھونڈھ نکالا تھا تو وہ

خفا ہو گیا تھا لیکن اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ اس کا عشق ایک ماورائی کیفیت لیے ہوئے تھا۔ اس کی شاعری میں ہوس اور شہوانی جذبے کی پرچھائیاں ضرور ملتی ہیں لیکن اس کی فطرت میں کوئی ایسا جوہر تھا جو ان چیزوں کو بھی پاکیزہ بنا دیتا تھا۔ اس کی ہوس میں گناہ کے احساس کا شائبہ تک موجود نہیں۔ وہ محبوب کی بارگاہ میں اس طرح داخل ہوتا ہے جیسے کوئی پجاری مندر میں۔ اس کی شاعری میں حصول کی تمنا بھی ہے اور محرومی کا غم بھی لیکن اس کے باوجود اس کا عشق ایک ایسا جذبہ ہے جس کی آسودگی خارج از بحث ہے۔ اسے خود بھی معلوم نہیں کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ یہ جسم کی بھوک نہیں روح کی پیاس ہے۔ محبت کی جسمانیت کا وہ قائل نہیں تھا۔ اس کی شاعری سے محبت کا جو پہلو ابھرتا ہے وہ اس کی الوہیت کا پہلو ہے جس کا سب سے واضح ثبوت وہ نظم ہے جو اس نے ایک شاعرہ کی شادی پر کہی۔ اس نظم میں شکایت یہ نہیں کہ وہ اختر کی بجائے کسی اور کی ہو گئی بلکہ اسے غم اس بات کا ہے کہ شاعرہ ایسی مطہر شخصیت جسمانی محبت میں آلودہ کیوں ہو گئی۔

تیرگی حرص کی اک حور کو بہکا ہی گئی
تیرے بستر پہ بھی آخر کو شکن آ ہی گئی

اس کی بے چین اور آزاد فطرت کسی بھی پابندی کی روادار نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کی شاعری سماج کی پابندیوں کے خلاف احتجاج ضرور ہے لیکن یہ احتجاج ان پابندیوں کے خلاف بھی ہے جو خود اس کے جسم نے اس کی روح پہ عائد کر رکھی تھیں۔ وہ زندگی بھر تمنا کرتا رہا کہ اس کا عشق

اسے "کہیں" لے جائے۔ یہ سدا بہار "کہیں" وہی میکدۂ ازل ہے جہاں اس کے پیشرو شاعر حافظ و خیام، رقصاں و غزلخواں تھے اور اس کا انتظار کر رہے تھے۔

اختر اپنے دور کا مقبول ترین شاعر تھا۔ ایک امیر اور انتہائی ذی وقار باپ کا بیٹا تھا۔ ادب اور شاعری اس کے لیے پیشہ نہیں مشغلہ تھے۔ اس کی شاعری کے رومانوی ماحول، اس کی مینوشی اور آوارہ مزاجی نے اسے دنیائے شعر و ادب کا رومانی شہزادہ بنا دیا تھا۔ رومانی شہزادہ بننا آسان ہے لیکن بنے رہنا اتنا آسان نہیں۔ لوگ رومانی شہزادے سے ہمہ وقت فوق الفطرت کارناموں کی امید رکھتے ہیں اور یہ کسی گوشت پوست کے انسان کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔

اپنے والد حافظ محمود خاں شیرانی سے آخری دنوں میں اس کا قریب قریب قطع تعلق ہو چکا تھا، جو شخص دوسروں کو پانی کی طرح شراب پلاتا تھا وہ اب شراب کے لیے دوسروں کا دست نگر تھا۔ اس بنا پر لوگ اس سے کنی بھی کترانے لگے تھے لیکن جو لوگ اس پر اس قسم کے الزام لگاتے ہیں کہ اس نے باقاعدہ دریوزہ گری شروع کر دی تھی وہ غالباً ذاتی تجربہ بیان کرنے کی بجائے سنی سنائی باتیں دہراتے ہیں۔ اختر نے شرافتِ نفس کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ روپے پیسے کو وہ آخری وقت تک حقارت سے دیکھتا رہا اور بے تکلف دستِ سوال بڑھا دینا اس کے بس ہی میں نہیں تھا۔

اختر بلانوش بھی تھا اور آوارہ بھی لیکن طبعاً وہ انتہائی شریف تھا۔ سماجی ذمہ داریوں کو نباہنے کا وہ اہل نہ سہی لیکن ان کا قائل ضرور تھا۔ اس نے آزادی

کے بھی ترانے گائے ہیں اور وطن دوستی کے بھی۔ آزادی پر وہ اپنا عشق تک قربان کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتا تھا اور وطن دوستی کا جذبہ جوش دکھاتا تھا تو وہ ساقی کو بھی تلوار اٹھانے کا مشورہ دیتا تھا عجیب بات یہ ہے کہ اس کا جنسی محبت کا جذبہ جتنا ماورائی ہے اتنا ہی اس کا وطن کی محبت کا جذبہ ارضی ہے۔ اس کی وطنی نظموں میں اس مٹی کی بو باس نمایاں طور پر موجود ہے جس سے اس کا خمیر اٹھا تھا۔

زمانہ بدلتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ مذاقِ شعری بھی۔ لیکن جیسا کہ اس مجموعے کے مطالعے سے محسوس ہوگا اختر شیرانی کی شاعری میں وہ جوہر موجود ہے جو اسے امتدادِ زمانہ کے اثرات سے محفوظ رکھے گا۔

اس مجموعے میں اختر کا سبھی قابلِ لحاظ کلام شامل ہے۔ صرف وہ چیزیں حذف کر دی گئی ہیں جو اختر نے اپنے غیر سنجیدہ لمحات میں صرف تفریح کے طور پر لکھ دی تھیں۔

گوپال متل

۲۸ مارچ ۱۹۶۹ء دہلی

میرا نظریۂ شعر

(اختر شیرانی)

......میں نے جب شعر کہنا شروع کیا تو شاعری کے افادی مقصد کا وہ تصور کہیں موجود نہ تھا جسے آج ترقی پسندی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس تصور نے کافی فروغ پالیا...... شاعر کا کام زندگی کے حسن کو خود دیکھنا اور دوسروں کو دکھانا ہے۔ زندگی کے ناسوروں کے علاج کی کوشش کرنا اس کا کام نہیں۔

......اس میں شک نہیں کہ موجودہ زمانے نے بعض ایسے ناگوار مسئلے ہمارے سامنے لا رکھے ہیں جن سے گریز ممکن ہے نہ مصالحت۔ سیاست میں عوام کی آواز اور خیالات کا اثر بڑھ گیا ہے، اقتصادی کش مکش ہمہ گیر ہوتی جارہی ہے، تجارتی لوٹ کھسوٹ کی گرم بازاری نے سماج کے ہر ایک طبقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور بے شمار ملک اور گروہ ہماری دنیا کے خوبصورت جسم پر بڑے بڑے ناسور بن کر رہ گئے ہیں۔ ہم شاعر بھی انسان ہونے کی حیثیت سے ان اثرات کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے لیکن ہمارا ان ناسوروں کی جراحی

کر کے انھیں ٹھیک کرنے کی کوشش کرنا ایک اناڑی کی کوشش سے زیادہ نہ ہو گا۔ ان کا علاج تو سیاسی اور اقتصادی ماہروں کے ہاتھ میں ہے اور انہی پر علاج کا فرض بھی عائد ہوتا ہے ....

...... شاعری افراد اور اقوام کے لیے ایک لطیف اور لذیذ غذا تو بن سکتی ہے جو ان کے ذائقے کی تشفی کرے اور اس کی عمدگی کو برقرار رکھے لیکن اس سے بیمار اور بوڑھی قوموں کے حق میں معجونِ شباب آور کا کام لینا میرے نزدیک بہت بڑی زیادتی ہے۔ ترقی پسندی کی تحریک کو جس قدر بھی فروغ اب تک حاصل ہوا ہے اس کا باعث اس کے بنیادی تصور کی دلکشی نہیں بلکہ اس کے لیبل کی دلکشی ہے۔ اس کے لیبل کو دیکھ کر ذہن سب سے پہلے ترقی پسندوں کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس جاتے ہیں.....

.... میرے نزدیک شاعر کے لیے اپنے آپ کو کسی سیاسی یا اقتصادی نظام سے وابستہ کرنا ضروری نہیں۔ وہ نظام سرمایہ داری ہو یا اشتراکیت، جمہوریت ہو یا فاشیت، شاعر کے لیے ان میں سے ایک بھی قابلِ توجہ نہیں۔ شاعر کی قدریں ان سب سے الگ اور آزاد ہیں۔

(۱۹۴۲ء کی ایک ریڈیائی تقریر سے)

نشیدِ آغاز

پھر قلم بے تاب ہے موتی لٹانے کے لیے
کہکشاں جھکنے لگی دامن بڑھانے کے لیے
پھر صلائے عام دی پیرِ مغانِ عشق نے
بادہ نوشانِ تخیّل کو جگانے کے لیے
زہرہ پھر بربط بکف، جوِّ ہوا میں آگئی
کارگاہِ خاک پر نغمے لُٹانے کے لیے
شمعِ دل کرتا ہوں روشن رہ گزارِ عشق پر
سوز و سازِ غم کی ہمّت آزمانے کے لیے
شوق نے بخشا ہے پھر بے رنگیوں کو آب و رنگ
قطرہ ہے آمادہ پھر دریا بہانے کے لیے
دل میں ذوقِ آرزو پھر چٹکیاں لینے لگا
حُسن کی نازک دلی کو گُدگُدانے کے لیے

پھر جبیں میں بال زن ہے موجِ بیتابیٔ عشق
آستانِ حُسن پر سجدے لٹانے کے لیے

گرچہ دُنیائے صحافت سے طبیعت سیر تھی
دل تھا مضطر، اک نئی دُنیا بسانے کے لیے

جس میں افکارِ زمانہ ہوں نہ افکارِ حیات
طبعِ رنگیں کی لطافت کو مٹانے کے لیے

جس میں بدذوقی کے صدمے ہوں نہ کج فہمی کا خوف
رُوح و دل کی خلوتوں میں بار پانے کے لیے

لیکن اہلِ دل کی بزم آرائیوں کو کیا کروں
چاہیے ہنگامہ جن کا دل لبھانے کے لیے

یہ وہ بازارِ زیاں ور ہے جس کو ہم نشیں
جنسِ کاسد چاہیے رونق بڑھانے کے لیے

رنگِ دورِ روزگارِ سفلہ پرور دیکھئے
شاعری ہے اک بہانہ مانگ کھانے کے لیے

آہ! وہ احساسِ شیریں نام ہے جس کا ادب
اک تجارت رہ گیا ہے اب مانے کے لیے

وہ گدازِ روح، دنیا شعر کہتی تھی جسے
لحنِ سائل بن گیا دولت کمانے کے لیے
جذبۂ دل اک کھلونا بن چلا بازار کا!
سادہ لوحوں کی مسرت کو بڑھانے کے لیے
آہ! وہ حکمت کہ تھی گنجِ ہزار انسانیت
دستِ مسکیں بن گئی جیبیں ہلانے کے لیے
خوابِ طفلاں کے جمالِ بے نیازی کی قسم
یہ چمن موزوں نہ تھا میرے ترانے کے لیے
میں کہاں، اخذِ متاعِ عالمِ فانی کہاں
طائرِ سدرہ نہیں تنکے اٹھانے کے لیے
میرے ذوقِ بیخودی کو دو جہاں ہیں نیم گام
وہ بھی رتبہ ان کی وسعت کا بڑھانے کے لیے
میں وہ مے کش ہوں کہ گلزارِ جناں سے صبح و شام
حوریں آتی ہیں مجھے کو تڑپانے کے لیے
میں وہ مجنوں ہوں کہ گر سیرِ جنوں منظور ہو
دشت میں آجائے لیلیٰ خاک اڑانے کے لیے

میں ہوں وہ وامق کہ ذوقِ بندگی ہو گر قبول
میرے در پر آئے عذرا سر جھکانے کے لیے

میں وہ خسرو ہوں کہ گر چاہوں ثبوتِ عاشقی
مضطرب شیریں ہو جُوئے شیر لانے کے لیے

میں وہ یوسف ہوں کہ ہو گر جستجوئے مُشتری
آئے خود حُسنِ ازل قیمت لگانے کے لیے

خاک و خاکستر نشینی گر مجھے منظور ہو!
جنّتیں لے آئیں پھول اپنے بچھانے کے لیے

میرے سینے میں ہیں وہ احساس کے شعلے نہاں
مہر و مہ ہیں مضطرب جن میں نہانے کے لیے

دل میں اُس وجدان کے کعبے ہیں رقصاں اے ندیم
جن میں آتے ہیں فرشتے سر جھکانے کے لیے

اک نگاہِ پُر تبسم، قیمتِ ہر دو جہاں
وہ بھی گر نورِ ازل آئے لبھانے کے لیے

دل کے کاشانے میں ہیں فانوس اشکِ سُرخ کے
آرزو، شعلہ ہے شمعِ غم جلانے کے لیے

الغرض جب دل کا گہوارہ ہو خود عرشِ بریں
وہ کھلونا بن نہیں سکتا زمانے کے لیے

اضطرابِ شوق، لیکن جنّتِ تسکین ہے
موت آتی ہے جہاں سجدے لٹانے کے لیے

شعلۂ دل، بوئے گل سے ہے طرب انگیز تر
نُور برساتا ہوں جنّت کو جلانے کے لیے

عشق کی دل میں خلش ہو، گو جہنّم بن کے ہو
خُلد کو چاہیں گے کیا قبریں بسانے کے لیے

اک حقارت کی ادا ہے، نذرِ مرگ و زندگی
آئے کوئی بے نیازی کو مٹانے کے لیے

وہم آبادِ عدم ہے، خوابِ طفلاں سے مُراد
موت، اک آئینہ، حیرت کو جگانے کے لیے

شورشِ آبادِ جہاں، بازیچۂ طفلانہ ہے
زندگی خوابِ پریشاں، بھول جانے کے لیے

موت ہے اک انتظار اور انتظارِ دائمی
کس قدر معصوم دھوکا جی لبھانے کے لیے

یہ نظامِ زندگی ہے نقشِ احساسِ خودی
ذرّہ ذرّہ مضطرب ہے سر اُٹھانے کے لیے

"نوبہار آمد نوائے بلبلاں مستانہ است
وقتِ جام است اے عزیزاں نوبتِ پیمانہ است"

نذرِ وطن

نذرِ وطن، پھر اے دلِ دیوانہ چاہیے
پھر ہر قدم پہ سجدۂ شکرانہ چاہیے

پھر سر زمینِ وطن کی ہے نظروں کے سامنے
پھر لب پہ ایک نعرۂ مستانہ چاہیے

بچپن کی یاد لیتی ہے پھر دل میں چٹکیاں
پھر بے خودیِ صحبتِ طفلانہ چاہیے

برسوں کے بعد آئے ہیں باغِ وطن میں ہم
پھر ہر کلی کو سجدۂ مستانہ چاہیے

کہسار سبز پوش نظر آئے دور سے
پھر لب پہ چار بیت کا افسانہ چاہیے

جس کوچے میں ہوئیں کبھی سوائیاں نصیب
اُس کا طواف بادلِ دیوانہ چاہیے

بخشا تھا جس نے پہلے پہل دل کو دردِ عشق
پھر اس کے در پہ سجدۂ شکرانہ چاہیے

پھر دل کو ہو یقین نہ کسی کے وصال کا
پھر واقعہ بصورتِ افسانہ چاہیے

پھر شوق سے ملیں گے کسی گلعذار سے
پھر لب پہ شورِ بلبلِ مستانہ چاہیے

جھولا جھلائیں گے کسی مستِ شباب کو
رقصاں فضا میں پھر مئے و میخانہ چاہیے

پائے طلب کو وادیٔ پروین ہے نیم گام — پھر آرزو کو منزلِ جاناں نہ چاہیے

پھر خرمنِ سکوں کو ہیں درکار بجلیاں — پھر بے حجابیٔ جلوۂ جاناں نہ چاہیے

پھر ذوقِ مے کشی کو ہے معراج کی طلب — کوثر کا بادہ، چاند کا پیمانہ چاہیے

پھر شوق بن کے دل میں دھڑکتی ہے زندگی — پھر جنبشِ تبسمِ جاناں نہ چاہیے

پھر سینۂ امید میں رقصاں ہے برقِ طور — پھر پرسشِ مذاقِ کلیمانہ چاہیے

بالائے کوہ سایۂ ابرِ بہار میں — پروین و ماہتاب کا کاشانہ چاہیے

پھر اس حریمِ نور کے آغوشِ ناز میں — اک گلکدہ بہ رنگِ پری خانہ چاہیے

پھر ابر و باغ و نکہتِ گل کے ہجوم میں — شمع و سرود و بادہ و پیمانہ چاہیے

پھر اس کی چشمِ مست پہ گیسو ہوں گر فشاں — پھر ابرِ شام گوں سرِ میخانہ چاہیے

پھر چاندنی میں امر و ریا یہ اے ندیم — رقصِ شراب و گردشِ پیمانہ چاہیے

جوشِ طرب نے حشر سا دل میں کیا بپا — پھر بے خودی کو گریۂ مستانہ چاہیے

اخترؔ وطن میں آ کے کھلا یہ حسین راز
اس مختصر سی عمر میں کیا کیا نہ چاہیے

وادیٔ گنگا میں ایک رات

کرتے ہیں مسافر کو محبت سے اشارے
اے وادیٔ گنگا ترے شاداب نظارے

یہ بکھرے ہوئے پھول، یہ نکھرے ہوئے تارے
خوشبو سے مہکتے ہوئے دریا کے کنارے

یہ چاندنی رات، اور یہ پُر خواب فضائیں
اک موجِ طرب کی طرح بے تاب فضائیں
سبزے کا ہجوم اور یہ شاداب فضائیں
مہکے ہوئے نظّارے ہیں، بہکے ہوئے تارے

یہ تارے ہیں یا نُور کے پیمانے ہیں روشن
معصوم گل انداموں کے کاشانے ہیں روشن
مستانہ ہواؤں پہ پری خانے ہیں روشن
یا دامنِ افلاک میں بے تاب شرارے

مہتاب ہے یا نور کی خوابیدہ پری ہے
الماس کی مورت ہے کہ مندر میں دھری ہے
مرمر کی صراحی ہے کہ سیمیں سے بھری ہے
اور تیرتی ہے نیل کی موجوں کے سہارے

نیندوں میں ہیں کھوئی ہوئی بیدار ہوائیں
گلزار ہیں گلریز و گہربار ہوائیں

ہیں نور میں بھیگی ہوئی سرشار ہوائیں
یا بال فشاں مستی و نکہت کے نظارے
ساحل ہیں کہ خوابیدہ نظاروں کے شبستاں
دامن میں لیے چاند ستاروں کے شبستاں
فردوس کی مستانہ بہاروں کے شبستاں
اختؔر کی تمنّا ہے یہیں رات گزارے

او دیس سے آنے والے بتا

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا — کس حال میں ہیں یارانِ وطن
آوارۂ غربت کو بھی سُنا — کس رنگ میں ہے کنعانِ وطن
وہ باغِ وطن، فردوسِ وطن — وہ سروِ وطن، ریحانِ وطن

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی وہاں کے باغوں میں مستانہ ہوائیں آتی ہیں؟
کیا اب بھی وہاں کے پربت پر گھنگور گھٹائیں چھاتی ہیں؟
کیا اب بھی وہاں کی برکھائیں ویسے ہی دلوں کو بھاتی ہیں؟

او دیس سے آنے والے بتا!

○

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی وطن میں ویسے ہی سرمست نظارے ہوتے ہیں؟
کیا اب بھی سہانی راتوں کو وہ چاند ستارے ہوتے ہیں؟
ہم کھیل جو کھیلا کرتے تھے کیا اب بھی وہ سارے ہوتے ہیں؟

او دیس سے آنے والے بتا!

○

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی شفق کے سایوں میں دن رات کے دامن ملتے ہیں؟
کیا اب بھی چمن میں ویسے ہی خوش رنگ شگوفے کھلتے ہیں؟
برساتی ہوا کی لہروں سے بھیگے ہوئے پودے ہلتے ہیں؟

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

شاداب و شگفتہ پھولوں سے — معمور ہیں گلزار اب کہ نہیں؟

بازار میں مالن لاتی ہے — پھولوں کے گندھے ہار اب کہ نہیں؟

اور شوق سے ٹوٹے پڑتے ہیں — نوعمر خریدار اب کہ نہیں؟

او دیس سے آنے والے بتا!

○

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا شام پڑے گلیوں میں وہی — دلچسپ اندھیرا ہوتا ہے؟

اور سڑکوں کی دھندلی شمعوں پر — سایوں کا بسیرا ہوتا ہے؟

باغوں کی گھنیری شاخوں میں — جس طرح سویرا ہوتا ہے؟

او دیس سے آنے والے بتا!

○

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی وہاں ویسی ہی جواں — اور مدھ بھری راتیں ہوتی ہیں؟

کیا رات بھر اب بھی گیتوں کی — اور پیار کی باتیں ہوتی ہیں؟

وہ حسن کے جادو چلتے ہیں — وہ عشق کی گھاتیں ہوتی ہیں؟

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

ویرانیوں کے آغوش میں ہے — آباد وہ بازار اب کہ نہیں ؟
تلواریں بغل میں داب ہوئے — پھرتے ہیں طرحدار اب کہ نہیں ؟
اور بہلیوں میں سے جھانکتے ہیں — ترکانِ سیہ کار اب کہ نہیں ؟
او دیس سے آنے والے بتا!

○

اَو دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی مہکتے مندر سے — ناقوس کی آواز آتی ہے ؟
کیا اب بھی مقدّس مسجد پر — مستانہ اذاں تھرّاتی ہے ؟
اور شام کے رنگیں سایوں پر — عظمت کی جھلک چھا جاتی ہے ؟
او دیس سے آنے والے بتا!

○

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی وہاں کے پنگھٹ پر — پنہاریاں پانی بھرتی ہیں ؟
انگڑائی کا نقشہ بن بن کر — سب ماتھے پہ گاگر دھرتی ہیں ؟
اور اپنے گھروں کو جاتے ہوئے — ہنستی ہوئی چہلیں کرتی ہیں ؟
او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

برسات کے موسم اب بھی وہاں ویسے ہی سہانے ہوتے ہیں؟
کیا اب بھی وہاں کے باغوں میں جھولے اور گانے ہوتے ہیں؟
اور دُور کہیں کچھ دیکھتے ہی نوعمر دِوانے ہوتے ہیں؟
او دیس سے آنے والے بتا!

○

او دیس سے آنے والے بتا!
کیا اب بھی پہاڑی چوٹیوں پر برسات کے بادل چھاتے ہیں؟
کیا اب بھی ہوائے ساحل کے وہ رس بھرے جھونکے آتے ہیں؟
اور سب سے اونچی ٹیکری پر لوگ اب بھی ترانے گاتے ہیں؟
او دیس سے آنے والے بتا!

○

او دیس سے آنے والے بتا!
کیا اب بھی پہاڑی گھاٹیوں میں گھنگھور گھٹائیں گونجتی ہیں؟
ساحل کے گھنیرے پیڑوں میں برکھا کی ہوائیں گونجتی ہیں؟
جھینگر کے ترانے جاگتے ہیں موروں کی صدائیں گونجتی ہیں؟
او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی وہاں میلوں میں وہی — برسات کا جوبن ہوتا ہے؟

پھیلے ہوئے بڑ کی شاخوں میں — جھولوں کا نشیمن ہوتا ہے؟

امڈے ہوئے بادل ہوتے ہیں — چھایا ہوا ساون ہوتا ہے؟

او دیس سے آنے والے بتا!

○

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا شہر کے گرد اب بھی ہے رواں — دریائے حسیں لہرائے ہوئے؟

جوں گود میں اپنے من کو لیے — ناگن ہو کوئی تھرائے ہوئے؟

یا نور کی ہنسلی حور کی گردن — میں ہو عیاں بل کھائے ہوئے؟

او دیس سے آنے والے بتا!

○

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی فضا کے دامن میں — برکھا کے سمے لہراتے ہیں؟

کیا اب بھی کنارِ دریا پر — طوفان کے جھونکے آتے ہیں؟

کیا اب بھی اندھیری راتوں میں — ملاح ترانے گاتے ہیں؟

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!
کیا اب بھی وہاں برسات کے دن — باغوں میں بہاریں آتی ہیں؟
معصوم و حسیں دوشیزائیں — برکھا کے ترانے گاتی ہیں؟
اور تیتریوں کی طرح سے رنگیں — جھولوں پہ لہراتی ہیں؟
او دیس سے آنے والے بتا!

○

او دیس سے آنے والے بتا!
کیا اب بھی اُفق کے سینے پر — شاداب گھٹائیں جھومتی ہیں؟
دریا کے کنارے باغوں میں — مستانہ ہوائیں جھومتی ہیں؟
اور اُن کے نشیلے جھونکوں سے — خاموش فضائیں جھومتی ہیں؟
او دیس سے آنے والے بتا!

○

او دیس سے آنے والے بتا!
کیا شام کو اب بھی جاتے ہیں — احباب، کنارِ دریا پر؟
وہ پیڑ گھنیرے اب بھی ہیں — شاداب، کنارِ دریا پر؟
اور پیار سے آکر جھانکتا ہے — مہتاب، کنارِ دریا پر؟
او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا آم کے اونچے پیڑوں پر — اب بھی وہ پپیہے بولتے ہیں؟

شاخوں کے حریری پردوں میں — نغموں کے خزانے کھولتے ہیں؟

ساون کے رسیلے گیتوں سے — تالاب میں امرس گھولتے ہیں؟

او دیس سے آنے والے بتا!

○

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا پہلی سی ہے معصوم ابھی — وہ مدرسے کی شاداب فضا؟

کچھ بھولے ہوئے دن گزرے ہیں — جس میں، وہ مثالِ خواب فضا؟

وہ کھیل، وہ ہمسن، وہ میداں — وہ خواب گہِ مہتاب فضا؟

او دیس سے آنے والے بتا!

○

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی کسی کے سینے میں — باقی ہے ہماری چاہ بتا؟

کیا یاد ہمیں بھی کرتا ہے اب — یاروں میں کوئی، آہ بتا؟

او دیس سے آنے والے بتا — للہ بتا، للہ بتا؟

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا ہم کو وطن کے باغوں کی — مستانہ فضائیں بھول گئیں؟

برکھا کی بہاریں بھول گئیں — ساون کی گھٹائیں بھول گئیں؟

دریا کے کنارے بھول گئے — جنگل کی ہوائیں بھول گئیں؟

او دیس سے آنے والے بتا!

○

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا گاؤں میں اب بھی ویسی ہی — مستی بھری راتیں آتی ہیں؟

دیہات کی کم سن ماہوشیں — تالاب کی جانب جاتی ہیں؟

اور چاند کی سادہ روشنی میں — رنگین ترانے گاتی ہیں؟

او دیس سے آنے والے بتا!

○

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی گجر دم چرواہے — ریوڑ کو چرانے جاتے ہیں؟

اور شام کے دھندلے سایوں کے — ہمراہ گھروں کو آتے ہیں؟

اور اپنی رسیلی بانسریوں میں — عشق کے نغمے گاتے ہیں؟

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا گاؤں پہ اب بھی ساون میں — برکھا کی بہاریں چھاتی ہیں؟

معصوم گھروں سے بھور بھئے — چکّی کی صدائیں آتی ہیں؟

اور یاد میں اپنے میکے کی — بچھڑی ہوئی سکھیاں گاتی ہیں؟

او دیس سے آنے والے بتا!

○

او دیس سے آنے والے بتا!

دریا کا وہ خواب آلودہ سا گھاٹ — اور اُس کی فضائیں کیسی ہیں؟

وہ گاؤں، وہ منظر، وہ تالاب — اور اُس کی ہوائیں کیسی ہیں؟

وہ کھیت، وہ جنگل، وہ چڑیاں — اور اُن کی صدائیں کیسی ہیں؟

او دیس سے آنے والے بتا!

○

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی پرانے کھنڈروں پر — تاریخ کی عبرت طاری ہے؟

اَن پورنا کے اُجڑے مندر پر — مایوسی و حسرت طاری ہے؟

سنسان گھروں پر چھاؤنی کے — ویرانی و رقّت طاری ہے؟

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

آخر میں یہ حسرت ہے کہ بتا — وہ غارتِ ایماں کیسی ہے؟
بچپن میں جو آفت ڈھاتی تھی — وہ آفتِ دوراں کیسی ہے؟
ہم دونوں تھے جس کے پروانے — وہ شمعِ شبستاں کیسی ہے؟

او دیس سے آنے والے بتا!

○

او دیس سے آنے والے بتا!

مرجانہ تھا جس کا نام بتا — وہ غنچہ دہن کس حال میں ہے؟
جس پر تھے فدا اطفالِ وطن — وہ جانِ وطن کس حال میں ہے؟
وہ سروِ چمن، وہ رشکِ سمن — وہ سیم بدن کس حال میں ہے؟

او دیس سے آنے والے بتا!

○

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی رخِ گلرنگ پہ — وہ جنت کے نظارے روشن ہیں؟
کیا اب بھی رسیلی آنکھوں میں — ساون کے ستارے روشن ہیں؟
اور اس کے گلابی ہونٹوں پر — بجلی کے شرارے روشن ہیں؟

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی شہابی عارض پر — گیسوئے سیہ بل کھاتے ہیں؟
یا بحرِ شفق کی موجوں پر — دو ناگ پڑے لہراتے ہیں؟
اور جن کی جھلک سے ساون کی — راتوں کے سے سپنے آتے ہیں؟

او دیس سے آنے والے بتا!

○

او دیس سے آنے والے بتا!

اب نامِ خدا، ہو گی وہ جواں — میکے میں ہے یا سسرال گئی؟
دوشیزہ ہے یا آفت میں اسے — کم بخت جوانی ڈال گئی؟
گھر پر ہی رہی، یا گھر سے گئی — خوشحال رہی، خوشحال گئی؟

او دیس سے آنے والے بتا!

اے عشق کہیں لے چل

اے عشق کہیں لے چل، اس پاپ کی بستی سے
نفرت گہِ عالم سے لعنت گہِ ہستی سے
ان نفس پرستوں سے اس نفس پرستی سے

دُور — اور کہیں لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!

ہم پریم پجاری ہیں، تو پریم کنہیّا ہے
تو پریم کنہیّا ہے، یہ پریم کی نیّا ہے
یہ پریم کی نیّا ہے، تو اس کا کھویّا ہے
کچھ فکر نہیں لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!

بے رحم زمانے کو اب چھوڑ رہے ہیں ہم
بے درد عزیزوں سے منہ موڑ رہے ہیں ہم
جو آس کہ تھی وہ بھی اب توڑ رہے ہیں ہم
بس تاب نہیں لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!

یہ جبر کدہ، آزاد افکار کا دشمن ہے
ارمانوں کا قاتل ہے، امیدوں کا رہزن ہے
احساس کا مقتل ہے، جذبات کا مدفن ہے
چل یاں سے کہیں لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!

آپس میں چھل اور دھوکے سنسار کی ریتیں ہیں
اس پاپ کی نگری میں اجڑی ہوئی پریتیں ہیں

یاں نیاتے کی ماریں ہیں، انیائے کی جیتیں ہیں
سُکھ چین نہیں لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!

اِک مذبحِ جذبات و افکار ہے یہ دنیا
اِک مسکنِ اشرار و آزار ہے یہ دنیا
اک مقتلِ احرار و ابرار ہے یہ دنیا
دُور اس سے کہیں لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!

یہ درد بھری دنیا بستی ہے گناہوں کی
دل چاک امیدوں کی، سفّاک نگاہوں کی
ظلموں کی، جفاؤں کی، آہوں کی، کراہوں کی
ہیں غم سے حزیں، لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!

آنکھوں میں سمائی ہے، اک خواب نما دنیا
تاروں کی طرح روشن مہتاب نما دنیا
جنّت کی طرح رنگیں، شاداب نما دنیا
لِللہ وہیں لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!

وہ تیرہو ساگر کی، رُت چھائی ہو پھاگن کی
پھولوں سے مہکتی ہو، پُروائی گھنے بن کی
یا آٹھ پہر جس میں جھڑ بدلی ہو ساون کی

جی بس میں نہیں لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!

قدرت ہو حمایت پر، ہمدرد ہو قسمت بھی
سلمٰی بھی ہو پہلو میں، سلمٰی کی محبّت بھی
ہر شے سے فراغت ہو اور تیری عنایت بھی

اے طفلِ حسیں لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!

اے عشق ہمیں لے چل، اک نور کی وادی میں
اک خواب کی دنیا میں، اک طور کی وادی میں
حُوروں کے خیالاتِ مسرور کی وادی میں

تا خُلدِ بریں لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!

سنسار کے اس پار اک اس طرح کی بستی ہو
جو صدیوں سے انساں کی صورت کو ترستی ہو

اور حسن کے نظاروں پر تنہائی برستی ہو
یوں ہو تو وہیں لے چل!
اے عشق، کہیں لے چل!

مغرب کی ہواؤں سے آواز سی آتی ہے
اور ہم کو سمندر کے اُس پار بلاتی ہے
شاید کوئی تنہائی کا دیس بتاتی ہے
چل اس کے قریں لے چل!
اے عشق، کہیں لے چل!

اک ایسی فضا جس تک غم کی نہ رسائی ہو
دنیا کی ہوا جس میں صدیوں سے نہ آئی ہو
اے عشق! جہاں تو ہو اور تیری خدائی ہو
اے عشق، وہیں لے چل!
اے عشق، کہیں لے چل!

ایک ایسی جگہ جس میں انسان نہ بستے ہوں
یہ مکر و جفا پیشہ حیوان نہ بستے ہوں
انساں کی قبا میں یہ شیطان نہ بستے ہوں
تو خوف نہیں لے چل!
اے عشق، کہیں لے چل!

برسات کی متوالی گھنگھور گھٹاؤں میں
کہسار کے دامن کی مستانہ ہواؤں میں
یا چاندنی راتوں کی شفّاف فضاؤں میں

اے زہرہ جبیں لے چل!
اے عشق، کہیں لے چل!

اِن چاند ستاروں کے بکھرے ہوئے شہروں میں
اِن نور کی کرنوں کی ٹھہری ہوئی نہروں میں
ٹھہری ہوئی نہروں میں سوئی ہوئی لہروں میں

اے خضرِ حسیں لے چل!
اے عشق، کہیں لے چل!

اک ایسی بہشت آئیں وادی میں پہنچ جائیں
جس میں کبھی دنیا کے غم دل کو نہ تڑپائیں
اور جس کی بہاروں میں جینے کے مزے آئیں

لے چل تو وہیں لے چل!
اے عشق، کہیں لے چل!

سلمیٰ

بہارِ حسن کا تو غنچۂ شاداب ہے سلمیٰ
تجھے فطرت نے اپنے دستِ رنگیں سے سنوارا ہے
بہشتِ رنگ و بو کا تو سراپا اک نظارہ ہے
تری صورت سراسر پیکرِ مہتاب ہے سلمیٰ
ترا جسم اک ہجومِ ریشم و کمخواب ہے سلمیٰ
شبستانِ جوانی کا تو اک زندہ ستارہ ہے
تو اس دنیا میں بحرِ حسنِ فطرت کا کنارہ ہے
تو اس سنسار میں اک آسمانی خواب ہے سلمیٰ

○

جہانِ قدس کا تو ایک فردوسی فسانہ ہے
تجھے مصرِ جمال و ناز کی اک ساحرہ کہیے
صنم آبادِ عفت کی مقدس کافرہ کہیے
ربابِ حسن کا تو ایک الہامی ترانہ ہے
پرستانِ لطافت کی تو اک رنگیں کہانی ہے
جوانِ فطرت کا تو اک گمشدہ خوابِ جوانی ہے

عذرا

پری وحور کی تصویرِ نازنیں، عذرا
شہیدِ جلوۂ دیدار کر دیا تُو نے
نظر کو محشرِ انوار کر دیا تُو نے

بہار و خواب کی تنویرِ مرمریں، عذرا
شراب و شعر کی تفسیرِ دل نشیں، عذرا
دل و دماغ کو سرشار کر دیا تُو نے
شباب و عشق کو بیدار کر دیا تُو نے

مری حسین، مری ناز آفریں عذرا

○

دیارِ دل میں تُو آئی بہار کی صورت
گدائے حُسن سے اظہارِ عشق تو نے کیا
گناہگار سے اقرارِ عشق تو نے کیا

بسی دماغ میں کیف و خمار کی صورت
مٹا سکے گا نہ اب پیرِ آسماں مجھ کو
کہ ہے نصیب، ترا عشقِ نوجواں مجھ کو

جہاں ریحانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

وہ اس وادی کی شہزادی تھی اور شاہانہ رہتی تھی
کنول کا پھول تھی، سنسار سے بیگانہ رہتی تھی
نظر سے دور، مثلِ نکہتِ مستانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

انہی صحراؤں میں وہ اپنے گلّے کو چراتی تھی
انہی چشموں پہ وہ ہر روز منہ دھونے کو آتی تھی
انہی ٹیلوں کے دامن میں وہ آزادانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

کھجوروں کے تلے، وہ جو کھنڈر سے جھلملاتے ہیں
یہ سب ریحانہ کے معصوم افسانے سناتے ہیں
وہ ان کھنڈروں میں اک دن صورتِ افسانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

مرے ہمدم، یہ نخلستان اک دن اس کا مسکن تھا
اسی کے خرمئی آغوش میں اس کا نشیمن تھا
اسی شاداب وادی میں وہ بے باکانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

یہ پھولوں کی حسیں آبادیاں، کاشانہ تھیں اُس کا
وہ اک بُت تھی یہ ساری وادیاں بتخانہ تھیں اس کا
وہ اس فردوسِ وجد و رقص میں مستانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

تباہی کی ہوا اس خاکِ رنگیں تک نہ آئی تھی
یہ وہ خطہ تھا جس میں نوبہاروں کی خدائی تھی
وہ اس خطے میں مثلِ سبزۂ بے گانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

اسی ویرانے میں اک دن بہشتیں لہلہاتی تھیں
گھٹائیں گھر کے آتی تھیں، ہوائیں مسکراتی تھیں
کہ وہ بن کر بہارِ جنتِ ویرانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی

یہ ویرانہ، گزر جس میں نہیں ہے کاروانوں کا
جہاں ملتا نہیں نام و نشاں تک سار بانوں کا
اسی ویرانے میں اک دن مری ریحانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

یہیں آباد تھی اک دن مرے افکار کی ملکہ
مرے جذبات کی دیوی، مرے اشعار کی ملکہ
وہ ملکہ، جو برنگِ عظمتِ شاہانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

صبا شاخوں میں نخلستاں کی جس دم سرسراتی ہے
مجھے ہر لہر سے ریحانہ کی آواز آتی ہے
یہیں ریحانہ رہتی ہے، یہیں ریحانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

فضائیں گونجتی ہیں اب بھی اُن وحشی ترانوں سے
سُنو، آواز سی آتی ہے اُن خاکی چٹانوں سے
کہ جن میں وہ برنگِ نغمۂ بے گانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

مرے ہمدم، جنونِ شوق کا اظہار کرنے دے
مجھے اس دشت کی اک اک کلی سے پیار کرنے دے
جہاں اک دن وہ مثلِ غنچۂ مستانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

بربِّ کعبہ، اُس کی یاد میں عمریں گنوا دوں گا
میں اس وادی کے ذرّے ذرّے پر سجدے بچھا دوں گا
جہاں وہ جانِ کعبہ، عظمتِ بُت خانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

وہ اس ٹیلے پر اکثر عاشقانہ گیت گاتی تھی
پُرانے سورماؤں کے فسانے گنگناتی تھی
یہیں پر، منتظر میری وہ بے تابانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

کھجوروں کے حسیں سائے زمیں پر لہلہاتے تھے
ستارے جگمگاتے تھے شگوفے کھلکھلاتے تھے
فضا میں منتشر اک نکہتِ مستانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

یہیں بستی تھی اے ہمدم، مرے رومان کی بستی
مرے احساس کی دنیا، مرے وجدان کی بستی
یہیں ریحانہ بستی تھی، یہیں ریحانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

شمیمِ زُلف سے اُس کی، مہک جاتی تھی کُل وادی
نگاہِ مست سے اُس کی، بہک جاتی تھی کُل وادی
ہوائیں پرفشاں روحِ مے و میخانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

وہ گیسوئے پریشاں، یا گھٹائیں رقص کرتی تھیں
فضائیں وجد کرتی تھیں، ہوائیں رقص کرتی تھیں
وہ اس فردوسِ وجد و رقص میں مستانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

گدازِ عشق سے لبریز تھا، قلبِ حزیں اُس کا
مگر آئینہ دارِ شرم تھا، روئے حسیں اُس کا
خموشی میں چھپائے نغمۂ مستانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

اُسے پھولوں نے میری یاد میں بے تاب دیکھا ہے
ستاروں کی نظر نے، رات بھر بے خواب دیکھا ہے
وہ شمعِ حُسن تھی، پر صورتِ پروانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

یہیں ہم رنگِ گلہائے حسیں، رہتی تھی ریحانہ
مثالِ حُورِ فردوسِ بریں، رہتی تھی ریحانہ
یہیں رہتی تھی ریحانہ، یہیں ریحانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

پیامِ دردِ دل، اختر دیئے جاتا ہوں وادی کو
سلامِ رخصتِ غمگیں، کیے جاتا ہوں وادی کو
سلام اے وادیٔ ویراں، جہاں ریحانہ رہتی تھی

دیارِ شیریں

دیکھ، اے دل نظر آیا وہ دیارِ شیریں
ذرّے ذرّے سے جھلکتی ہے بہارِ شیریں
اک دلِ غم زدہ و دیدۂ پُر نم کے سوا
پاس کچھ بھی تو نہیں بہرِ نثارِ شیریں

مدد اے دیدہ گریاں کہ نہیں صبر کی تاب
وہ نظر آنے لگی راہ گزارِ شیریں

نالۂ نیم شبی ہو کہ دعائے سحری
مضطرب ہیں پئے دیدارِ دیارِ شیریں

آئے ہیں پہلے پہل بارگہِ شیریں میں
جان و دل کو لیے ہم بہرِ نثارِ شیریں

حشر تک کے لیے قدموں میں جگہ مل جائے
خاک کر دے مجھے اے خاکِ دیارِ شیریں

نکہتِ حسن سے ہے محفلِ ہستی شاداب
خندہ زن خلد پہ ہے خاکِ جوارِ شیریں

خاکِ لاہور ہے گہوارۂ شانِ عظمت
اختر اس خاک میں روشن ہے وقارِ شیریں

جوگن

دیکھو! وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے
موسیقیٔ حزیں کے دریا بہا رہی ہے

غمگیں نوائیوں سے بے خود بنا رہی ہے
دنیا کے ہر اثر کو دل سے مٹا رہی ہے

سوئی ہوئی فضا کا شانہ ہلا رہی ہے
ہر جنبشِ زباں سے مردے جلا رہی ہے

بیدار کر رہی ہے مدہوش گھاٹیوں کو — خوابیدہ ساحلوں کی نیندیں اڑا رہی ہے
ہر لرزشِ صدا میں طوفاں امنڈ رہے ہیں — کس مُدھ بھری ادا سے تانیں لگا رہی ہے

دیکھو! وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے

اٹکھیلیوں کا سن ہے ہنس بولنے کے دن ہیں — لیکن نہ جانے کیوں وہ آنسو بہا رہی ہے
آئینہ رنگ سینہ کچھ کھل رہا ہے جس میں — دوشیزگی کی گنگا طوفاں اٹھا رہی ہے
اک گیروا سی ساڑی ہے جسمِ مرمریں پر — یا ہلکی ہلکی بدلی سورج پہ چھا رہی ہے
اک بحرِ یاسمیں پر لہرا رہی ہے ناگن — یا اس کی زلفِ مشکیں سینہ پہ آ رہی ہے
ہے اک ستار اس کے آغوشِ نازنیں میں — دو نازک انگلیوں سے جس کو بجا رہی ہے

دیکھو! وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے

سینے پہ چاندنی کے بادل برس رہے ہیں — یا کوئی حورِ جنّت آنسو بہا رہی ہے
ہے موجزن فضا میں اک آبشارِ شیریں — یا ملکۂ پرستاں موتی لٹا رہی ہے
اک گردِ مرمریں سی چھائی ہوئی افق پر — جس کو ہوائے صحرا ہر سو اڑا رہی ہے
اک موجِ گوہریں سی ہر پھول پر ہے رقصاں — نغمے کی روحِ رنگیں جس میں سما رہی ہے
یا دن کے مقبرے پر دوشیزۂ شب آ کر — گلہائے نور کی اک چادر چڑھا رہی ہے

دیکھو! وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے

فرشِ زمرّدیں پہ کچھ پھول سو رہے ہیں — نغمے کے پر کی جنبش جن کو جگا رہی ہے
جنگل مہک رہا ہے کلیاں چٹک رہی ہیں — ہر تان میں الٰہی کیا گل کھلا رہی ہے

وادی میں موجِ حزن ہے نغموں کا کیفِ لرزاں
ہر پھول ہر کلی پر مستی سی چھا رہی ہے
اک نہر بہہ رہی ہے تھوڑے سے فاصلے پر
گاتی ہوئی جو اپنی منزل کو جا رہی ہے
یا جل پری اُرو بیلی ہو جوں کے بربطوں پر
تاروں کے دیوتا کو نغمے سنا رہی ہے

دیکھو! وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے

جنگل کے جانور کچھ بیٹھے ہیں اُس کے آگے
رو رو کے جن کو اپنی بپتا سنا رہی ہے
خونخوار شیر بھی ہیں وحشی غزال بھی ہیں
لیکن وہ سب کے دل پر سکتہ جما رہی ہے
کچھ سانپ جھومتے ہیں رہ رہ کے مست ہو کر
اک موجِ وجد اُن کی رگ رگ پہ چھا رہی ہے
طاؤس ناچتے ہیں یوں بے قرار ہو کر
گویا ہر ایک پر میں بجلی سما رہی ہے
ایسا سماں بندھا ہے غمگیں نوائیوں سے
رو رو کے جیسے فطرت طوفاں اُٹھا رہی ہے

دیکھو! وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے

یہ موہنی ہے، کس کی لگن میں جوگن؟
یہ سیلِ درد کس کے غم میں بہا رہی ہے
ہاں شاید اس کی ننھی معصوم آتمائیں
ہر کی پریم اگنی لو کے لگا رہی ہے
ہر بن میں ہر نگر میں، ہر گھر میں، ہر ڈگر میں
پھر پھر کے اپنے من کی چنتا مٹا رہی ہے
یا ہر کی جستجو میں، پتیم کی آرزو میں
کاشی سے آ رہی ہے، متھرا کو جا رہی ہے
یا جگ کی آفتوں سے تنگ آ کے بن میں جا کر
پرماتما کو اپنا دکھڑا سنا رہی ہے

دیکھو! وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے

ہر لفظ میں چھپی ہے وحشت کی ایک دنیا
دل کی ہر آرزو کو مجنوں بنا رہی ہے

اک آگ سی بھری ہے غمگین راگنی میں
دیپک سنا سنا کر تن من جلا رہی ہے

روحانیت کے نغمے لب پر تڑپ رہے ہیں
ملکِ ابد کی جانب سب کو بلا رہی ہے

پردہ سا اُٹھ گیا ہے آنکھوں کے سامنے سے
کیا جانے کس جگہ کے جلوے دکھا رہی ہے

کچھ سوز ہے بیاں میں، کچھ درد داستاں میں
شعلے اُگل رہی ہے چھریاں چلا رہی ہے

دیکھو! وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے

دنیا سے ہو رہی ہے، بیزار میری ہستی
دل ہاتھ سے چلا ہے جاں لب پہ آ رہی ہے

بتخانۂ جبیں میں سجدے مچل رہے ہیں
کافر ادا صنم ہے، کافر بنا رہی ہے

معمورِ غم نوائی ہے ہر کلی کا دامن!
فیاض مطربہ ہے نغمے لٹا رہی ہے

اک صوتِ سرمدی ہے ہر ذرّے کی زباں پہ
موسیقیِ ازل کے نغمے سنا رہی ہے

ساری فضا پہ طاری ہے اک غبارِ ماتم
گویا تمام وادی آنسو بہا رہی ہے

دیکھو! وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے

اب نغمے سو گئے ہیں، باجہ بھی تھک چلا ہے
محشر اُٹھا چکی ہے، فتنے جگا رہی ہے

ایسی دبی صدا ہے، گویا عروس نغمہ
منہ پھیر کر ہوا سے دامن چھڑا رہی ہے

یا کچھ غنودگی کے عالم میں مست کوئل
کلیوں کے، راگنی سے دل گدگدا رہی ہے

کچھ کھل گیا ہے جیسے بادل کوئی برس کر
یا شمع جل جلا کر اب جھلملا رہی ہے

لو! وہ ستار کو بھی نیند آ گئی بغل میں
لو! وہ ستار اٹھا کر جنگل سے جا رہی ہے

دیکھو! وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے

میں تو مگر کچھ ایسا محسوس کر رہا ہوں
جیسے وہ ظالم ابتک ویسے ہی گا رہی ہے
اب تک فضا پہ ہے وہ کھویا ہوا سا عالم
ابتک افق پہ یکسر مستی سی چھا رہی ہے
اب تک اٹھا رہا ہے ساز اس کا ابرِ نغمہ
اب تک زبان اس کی بجلی گرا رہی ہے
پھولوں سے ابتک اس کے نغمے اُبل رہے ہیں
پتوں سے ابتک اس کی آواز آ رہی ہے
اب تک ہیں سر جھکائے حیرت زدہ کھڑا ہو
اب تک وہی تجلی آنکھوں پہ چھا رہی ہے
دیکھو! وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے

اُف ری جوانی ہائے زمانے

عشق کا موسم، غم کی ہوائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے
دل میں تمنا، لب پہ دعائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے
یاروں کا گہری نیند میں سونا، دل کا کسی کی یاد میں کھونا
شوق کو یہ ضد سب کو جگائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے
عشق کی نادانی کا فسانہ، عقل کی حیرانی کا زمانہ
سر میں جنوں، آنکھوں میں حیائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے
شوق کی پہلی نیند اُچٹنا، عشق کی پچھلی رات نہ کٹنا
دل میں امیدیں، لب پہ دعائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے

دُور سے ان کو دیکھتے رہنا، منہ سے مگر اک حرف نہ کہنا
سادہ نگاہیں، بھولی ادائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے

پاک سہانی گھر کی فضائیں، بوئے حنا سے مست ہوائیں
صحن میں بنتِ عم کی صدائیں، اُف ری جوانی، ہائے زمانے

چاندنی راتیں سوئی ہوئی سی، نیند میں فطرت کھوئی ہوئی سی
مست فضائیں، سرد ہوائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے

گھر پہ کسی کے رات گزرنا، اور وہ اس کا صبح کو ڈرنا
"دیکھو کنیزیں دیکھ نہ پائیں" اُف ری جوانی ہائے زمانے

جھُولے پہ اُن کو چھیڑتے رہنا، اور وہ اُن کا ناز سے کہنا
"آپ نہ جھُولا اب سے جھُلائیں" اُف ری جوانی ہائے زمانے

اُن کا بلانا، آپ نہ جانا، راہ دکھانا رات جگانا!
تاکہ ابھی وہ اور منائیں "اُف ری جوانی ہائے زمانے

صحنِ چمن اور بادہ پرستی، رات کا منظر عالمِ مستی
قدموں پہ ساغر سر پہ گھٹائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے

وہ مری راتیں مہکی ہوئی سی، وہ مری باتیں بہکی ہوئی سی
مرنے کے دن جینے کی دعائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے

ایک گلی سے روز گزرنا، گرچہ کسی سے بات نہ کرنا
سینے میں دھڑکن، منہ پہ ہوائیں، اُف ری جوانی، ہائے زمانے

پھر یہ وہ اک مہ پارہ کا آنا، بات نہ کرنا آنکھ چُرانا
دل میں خلش تنہا کبھی پائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے

چاندنی اور دریا میں سفینہ، ہاتھ میں مینا ساتھ حسینہ
ساز کے لب پہ مست صدائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے

باغ کا وہ پھولوں سے مہکنا، وقت کا خوشبو بن کے لہکنا
چاندنی راتیں، مست ہوائیں، اُف ری جوانی، ہائے زمانے

گاؤں کے حسن پنگھٹ پہ بھی جانا لے کے گاگر سر پہ رکھانا
ہنستی رہیں گھونگھٹ میں ادائیں، اُف ری جوانی، ہائے زمانے

یاد میں آنسو بہتے ہیں اختر کھوئے ہوئے سے رہتے ہیں اختر
دل سے سمے وہ کیسے بھلائیں، اُف ری جوانی، ہائے زمانے

ایک شاعرہ کی شادی پر

اے کہ تھا اُنس تجھے عشق کے افسانوں سے
زندگانی تری آباد تھی رومانوں سے

شعر کی گود میں پلتی تھی جوانی تیری
تیرے شعروں سے اُبلتی تھی جوانی تیری
رشکِ فردوس تھا ہر حُسن بھرا خواب ترا
ایک پامال کھلونا تھا یہ مہتاب ترا
نکہتِ شعر سے مہکی ہوئی رہتی تھی سدا
نشۂ فکر میں بہکی ہوئی رہتی تھی سدا
شرکتِ غیر سے بیگانہ تھے نغمے تیرے
عصمتِ حُور کا افسانہ تھے نغمے تیرے
شعر کی خلوتِ رنگیں تھی پری خانہ ترا
مست خوابوں کے جزیروں میں تھا کاشانہ ترا
غائب از چشم تھی جنّت کی بہاروں کی طرح
دستِ انساں سے تھی محفوظ ستاروں کی طرح
صحبتِ غیر سے گھبراتی تھی تنہائی تری
آئینے سے بھی تو شرماتی تھی تنہائی تری
صبح کی طرح سے دوشیزہ تھی ہستی تیری
بوئے گل کی طرح پاکیزہ تھی ہستی تیری

نغمہ و شعر کے فردوس میں تو رہتی تھی
تیرا الہام و ترنم تھا جو تو کہتی تھی
تیرے اشعار تھے، جنّت کی بہاروں کے ہجوم
تیرے افکار تھے، زرّین ستاروں کے ہجوم
دردِ شعری کے تأثر سے تو مغموم تھی تو
آسماں کا مگر اک غنچۂ معصوم تھی تو
موجِ کوثر کا چھلکتا ہوا پیمانہ تھی
غیر ہونٹوں کے تصوّر سے بھی بیگانہ تھی

○

اب گوارا ہوئی کیوں غیر کی صحبت تجھ کو؟
کیوں پسند آگئی ناجنس کی شرکت تجھ کو؟
اوجِ تقدیس کو پستی کی ادا بھا گئی کیوں؟
تیری تنہائی کی جنّت پہ خزاں چھا گئی کیوں؟
شعر و رومان کے وہ خواب کہاں ہیں تیرے؟
وہ نقوشِ گل و مہتاب کہاں ہیں تیرے؟
کون سی طرفہ ادا بھا گئی اس دنیا میں؟
خلد کو چھوڑ کے کیوں آگئی اس دنیا میں؟

ہوگئی عام تو نورِ مہِ تاباں کی طرح
آہ! کیوں جل نہ بجھی شمعِ شبستاں کی طرح

اپنی دوشیزہ بہاروں کو نہ کھونا تھا کبھی
وہ کلی تھی تو، جسے پھول نہ ہونا تھا کبھی

عفتیں مٹ کے، جوانی کو مٹا جاتی ہیں
پھول کمھلاتے ہیں، کلیاں کہیں کمھلاتی ہیں

بلبلِ مست نوا، دشت میں کیوں رہنے لگی؟
نغمۂ تر کی جگہ، مرثیہ کیوں کہنے لگی؟

ہوس آلودہ ہوئی پاک جوانی تیری
غیر کی رات ہے اب اور کہانی تیری

کس کو معلوم تھا تو اس قدر ارزاں ہوگی
زینتِ محفل و پامالِ شبستاں ہوگی

جذبِ عفت کا میسر تھا جو عرفاں تجھ کو
کیوں نہ مرغوب ہوا شیوۂ جاناں[1] تجھ کو

تیرگی حرص کی، اک حور کو بہکا ہی گئی
تیرے بستر پہ بھی آخر کو شکن آ ہی گئی

---

[1] جاناں بیگم

اب نہیں تجھ میں وہ حوروں کی سی عفّت باقی
حُور تھی تجھ میں گئی، رہ گئی عورت باقی
ہاں وہ عورت جسے بچّوں کا فسانہ کہیے
بر بطِ نفس کا اک فحش ترانہ کہیے
جس میں ہے زہرِ عفونت کا وہ پیمانہ کہیں
اک گناہوں کا سبھکتا ہوا مے خانہ کہیں
نوحہ خواں اپنی جواں موت کا ہونے دے مجھے
مُسکرا تو، مگر اس حال پہ رونے دے مجھے

اعترافِ محبّت

لو آؤ کہ رازِ پنہاں کو رسوائے حکایت کرتا ہوں
دامانِ زبانِ خامشی کو لبریز شکایت کرتا ہوں
گھبرا کے ہجومِ غم سے آج افشائے حقیقت کرتا ہوں
اظہار کی جرأت کرتا ہوں
میں تم سے محبت کرتا ہوں

فکر آبادِ دنیا میں مری اک مسجودِ افکار ہو تم
شعرستانِ ہستی میں مری اک معبودِ اشعار ہو تم
اور میرے پرستش زارِ دل میں اک بتِ شیریں کار ہو تم
میں حسن کی عبادت کرتا ہوں
میں تم سے محبت کرتا ہوں

مدت سے محبت کرتا تھا، سو جان سے تم پر مرتا تھا
راتوں کو میں روتا رہتا تھا، راتوں کو میں آہیں بھرتا تھا
ہاں راتوں کو آہیں بھرتا تھا، پر تم سے جو کہتے ڈرتا تھا
آج اس کی جسارت کرتا ہوں
میں تم سے محبت کرتا ہوں

راتوں کو مرے رونے کا سماں، بیدار ستارے دیکھتے ہیں
اور میرے جنوں کے عالم کو، عالم کے نظارے دیکھتے ہیں
باغوں کے مناظر دیکھتے ہیں، نہروں کے کنارے دیکھتے ہیں
یوں شرح مصیبت کرتا ہوں
میں تم سے محبت کرتا ہوں

حسرت بھری فریادوں کو مری باغوں کی فضائیں جانتی ہیں
فریاد سے لبریز آہوں کو صحرا کی ہوائیں جانتی ہیں

اور میرے مچلتے آنسوؤں کو ساون کی گھٹائیں جانتی ہیں

اظہارِ حقیقت کرتا ہوں
میں تم سے محبت کرتا ہوں

جس دن سے وہ صورت دیکھی ہے سو آرزوئیں بیتاب سی ہیں
دن ہیں تو وہ بے آرام سے ہیں، راتیں ہیں تو وہ بےخواب سی ہیں
آنکھوں تلے ہر دم پھرتی ہیں وہ "ساعدیں" جو مہتاب سی ہیں

یاد اُن کی صباحت کرتا ہوں
میں تم سے محبت کرتا ہوں

تم چاند سے بڑھ کر روشن ہو زہرہ کی قسم تاروں کی قسم
تم پھول سے بڑھ کر رنگیں ہو فطرت کے چمن زاروں کی قسم
تم سب سے حسیں ہو دنیا میں، دنیا کے نظاروں کی قسم

دنیا سے بھی نفرت کرتا ہوں
میں تم سے محبت کرتا ہوں

اس مکر کی دنیا میں کہ جہاں معیارِ صداقت کچھ بھی نہیں
"دو اشکوں" سے بڑھ کر سچا اور اظہارِ محبت کچھ بھی نہیں
روتا ہوں تمہاری یاد میں گو رونے کی شہادت کچھ بھی نہیں

پیش اتنی شہادت کرتا ہوں
میں تم سے محبت کرتا ہوں

جب رات کی بیکس تنہائی میں آپ کو تنہا پاتا ہوں
میں بربطِ دل پر سوز و گدازِ عشق کے نغمے گاتا ہوں
اتنا تو بتا دو تم بھی مجھے، کیا میں بھی کبھی یاد آتا ہوں
بتلاؤ کہ منّت کرتا ہوں
میں تم سے محبّت کرتا ہوں

گو تم سے مجھے نسبت نہیں کچھ اور ہے تو گدا و شاہ کی ہے
وہ ذرّہ ہوں جس کے دل میں نہاں امیّدِ وصالِ ماہ کی ہے
اک شاعرِ مفلس جس کو ہوس اک قیصرۂ ذی جاہ کی ہے
پھر بھی یہ جسارت کرتا ہوں
میں تم سے محبّت کرتا ہوں

گر حکم دو روشن تاروں کو میں لا کے جھکا دوں قدموں پر
جنّت کے شگفتہ پھولوں کی جنّت سی بسا دوں قدموں پر
سجدہ گہِ مہر و ماہ کو بھی سجدے میں گرا دوں قدموں پر
ناچیز ہوں ہمّت کرتا ہوں
میں تم سے محبّت کرتا ہوں

بوڑھائی نرس

میں جب کمسن تھا اور تو اپنے سینے سے لگاتی تھی

تری ہنستی ہوئی نظروں سے مجھ کو شرم آتی تھی

مچلتا تھا میں تیری گود سے باہر نکلنے کو

مگر تو اک ادائے مطمئن سے مسکراتی تھی

ترے وہ گیت، اب تک گونجتے ہیں میرے کانوں میں

جنھیں میرے لیے گاتی تھی تو اور گنگناتی تھی

سمجھتا تھا بہت کم، مطلب ان گیتوں کا میں لیکن

تری اس شوخیِ گویا سے مجھ کو شرم آتی تھی

ترا وہ مخملی بستر، ابھی تک یاد ہے مجھ کو

مجھے سردی کے ڈر سے، جس میں تو اکثر سلاتی تھی

وہ بستر، یاسمیں بستر، سراسر عنبریں بستر

مہک سے جس کی حورانِ جناں کو نیند آتی تھی

میں سوچا تا تھا جب رنگیں دلائی اوڑھ کر تیری

تو اپنے مرمریں ہاتھوں سے مجھ کو گدگداتی تھی

وہ تیری خواب گہ کے نیلگوں ابریشمی پردے
سرِ شام آ کے نرگس جن کو چپکے سے گراتی تھی
دماغ اب تک معطّر ہے تری مستانہ خوشبو سے
ترے گجروں کی کلیوں کو بھی جو لے خود بناتی تھی
ترا مشکیں تنفّس بس رہا ہے اب بھی ہونٹوں میں
اثر سے جس کے اک لرزش سی دل میں تیر جاتی تھی
تری رنگیں جوانی نقش ہے اب تک مرے دل پر
جو تیرے پھول سے پیکر کے اندر لہلہاتی تھی
تری وہ محفلیں آباد ہیں اب تک تصوّر میں
تو جن میں، اپنی گڑیا سے مری شادی رچاتی تھی
تری آنکھیں، وہ شوخ آنکھیں نہیں بھولیں ابھی مجھ کو
کہ جن میں اک رسیلی مسکراہٹ جھلملاتی تھی
مگر اے شاہزادی، آج کچھ تجھ کو خبر بھی ہے
کہ وہ کم سن جسے تو اپنے سینے سے لگاتی تھی
وہ شاعر ہے کہ دنیا میں کہانی اُس کی رسوا ہے
وہ رُسوا، اُس کا دل رُسوا، جوانی اُس کی رسوا ہے

وکٹوریہ میموریل میں

(چند زندہ تصویریں دیکھ کر)

حسین چہروں سے رنگیں نقاب اٹھائے ہوئے
شرر آنکھوں میں سو بجلیاں بسائے ہوئے

خرام ناز پہ مستانہ لغزشوں کا ہجوم
فضا کی گود میں میخانے تھرتھرائے ہوئے

سیاہ برقعوں میں شاداب و نازنیں چہرے
حسین تارے گھٹاؤں میں جگمگائے ہوئے

گھنیری زلفوں کے سائے میں عارضوں کی بہار
اندھیری شاخوں میں کچھ پھول لہلہائے ہوئے

سیہ نقاب میں روشن شفق نما رخسار
چراغ رات کے پردوں میں جھلملائے ہوئے

شفق کی موج میں تنویر رنگ و بو رقصاں
کہ ان کے لب پہ تبسم ہے لہلہائے ہوئے

فسردہ کیسے گلِ ماہتاب کا جس کو
جوان چہروں پہ وہ نور جگمگائے ہوئے

رخِ صبیح پہ گیسوئے مشک بو کا ہجوم
فرشتے جانبِ افلاک پر اٹھائے ہوئے

فضائے کاکلِ مشکیں میں شعلہ گوں عارض
سوادِ شام میں آتش کدے جلائے ہوئے

قدم قدم پہ نگاہوں کو دعوتِ سجدہ
کنارِ شام میں بتخانے سے بسائے ہوئے

فضائے باغ میں لرزاں وہ پھول سے پیکر
شفق میں ڈوبے ہوئے نور میں نہائے ہوئے

وہ ہر نظر میں کوئی ماجرا طراز ادا
وہ ہر ادا میں کوئی راز سا چھپائے ہوئے

زبانِ حافظ و خیام میں تکلم ریز
شرابِ شعر کے بادل فضا پہ چھائے ہوئے

بھلا چکی جنھیں صدیوں سے سرزمینِ عجم — نقاب میں وہی آتش کدے چھپائے ہوئے

ہر اک ادا عجمیت کے رنگ سے سرشار — میموریل کو سوادِ عجم بنائے ہوئے

نگاہِ یاس کو اذنِ کلام دیتی جاؤ
مسافرانِ حزیں کا سلام لیتی جاؤ

اے عشق ہمیں برباد نہ کر

اے عشق نہ چھیڑ آ کے ہمیں، ہم بھولے ہوؤں کو یاد نہ کر
پہلے ہی بہت ناشاد ہیں ہم، تو اور ہمیں ناشاد نہ کر
قسمت کا ستم ہی کم نہیں کچھ، یہ تازہ ستم ایجاد نہ کر
یوں ظلم نہ کر، بیداد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

جس دن سے ملے ہیں دونوں کا سب چین گیا، آرام گیا
چہروں سے بہارِ صبح گئی، آنکھوں سے فروغِ شام گیا
ہاتھوں سے خوشی کا جام چھٹا، ہونٹوں سے ہنسی کا نام گیا
غمگیں نہ بنا، ناشاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

ہم راتوں کو اُٹھ کر روتے ہیں، رو رو کے دعائیں کرتے ہیں
آنکھوں میں تصوّر، دل میں خلش، سر دھنتے ہیں آہیں بھرتے ہیں
اے عشق! یہ کیسا روگ لگا، جیتے ہیں نہ ظالم مرتے ہیں
یہ ظلم تو اے جلّاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

یہ روگ لگا ہے جب سے ہمیں، رنجیدہ ہوں میں، بیمار ہے وہ
ہر وقت تپش، ہر وقت خلش، بیخواب ہوں میں، بیدار ہے وہ
جینے سے اِدھر بیزار ہوں میں، مرنے پہ اُدھر تیّار ہے وہ
اور ضبط کہے فریاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

جس دن سے بندھا ہے دھیان ترا گھبرائے ہوئے سے رہتے ہیں
ہر وقت تصوّر کر کر کے شرمائے ہوئے سے رہتے ہیں
کملائے ہوئے پھولوں کی طرح کملائے ہوئے سے رہتے ہیں
پامال نہ کر، برباد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

بیدرد! ذرا انصاف تو کر، اس عمر میں اور مغموم ہے وہ
پھولوں کی طرح نازک ہے ابھی، تاروں کی طرح معصوم ہے وہ

یہ حسن، ستم! یہ رنج، غضب! مجبور ہوں میں! مظلوم ہے وہ
مظلوم پہ یوں بیداد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

اے عشق خدارا دیکھ کہیں، وہ شوخِ حزیں بدنام نہ ہو
وہ ماہ لقا بدنام نہ ہو، وہ زہرہ جبیں بدنام نہ ہو
ناموس کا اس کے پاس رہے، وہ پردہ نشیں بدنام نہ ہو
اس پردہ نشیں کو یاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

اُمیدؔ کی جھوٹی جنّت کے، رہ رہ کے نہ دکھلا خواب ہمیں
آئندہ کی فرضی عشرت کے، وعدوں سے نہ کر بیتاب ہمیں
کہتا ہے زمانہ جس کو خوشی، آتی ہے نظر کمیاب ہمیں
چھوڑ ایسی خوشی کو یاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

کیا سمجھے تھے اور تو کیا نکلا، یہ سوچ کے ہی حیران ہیں ہم
ہے پہلے پہل کا تجربہ اور کم عمر ہیں ہم، انجان ہیں ہم
اے عشق! خدارا رحم و کرم! معصوم ہیں ہم نادان ہیں ہم
نادان ہیں ہم، ناشاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

وہ راز ہے یہ غم آہ جسے، پا جائے کوئی تو خیر نہیں
آنکھوں سے جب آنسو بہتے ہیں آ جائے کوئی تو خیر نہیں
ظالم ہے یہ دنیا، دل کو یہاں، بھا جائے کوئی تو خیر نہیں
ہے ظلم، مگر فریاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

دو دن ہی میں عہدِ طفلی کے، معصوم زمانے بھول گئے
آنکھوں سے وہ خوشیاں مٹ سی گئیں، لب کو وہ ترانے بھول گئے
اُن پاک بہشتی خوابوں کے، دلچسپ فسانے بھول گئے
اُن خوابوں سے یوں آزاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

اُس جانِ حیا کا بس نہیں کچھ، بے بس ہے پرائے بس میں ہے
بے درد دلوں کو کیا ہے خبر، جو پیار یہاں آپس میں ہے
ہے بے بسی زہر اور پیار ہے رس، یہ زہر چھپا اس رس میں ہے
کہتی ہے حیا فریاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

آنکھوں کو یہ کیا آزار ہوا، ہر جذبِ نہاں پر رو دینا
آہنگِ طرب پر جھک جانا، آوازِ فغاں پر رو دینا

بربط کی صدا پر رو دینا، مطرب کے بیاں پر رو دینا
احساس کو غم بنیاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

ہر دم ابدی راحت کا سماں دکھلا کے ہمیں دلگیر نہ کر
للہ حباب آب رواں پر نقشِ بقا تحریر نہ کر
مایوسی کے رمتے بادل پر امیّد کے گھر تعمیر نہ کر
تعمیر نہ کر، آباد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

جی چاہتا ہے اک دوسرے کو یوں آٹھ پہر ہم یاد کریں
آنکھوں میں بسائیں خوابوں کو، اور دل میں خیال آباد کریں
خلوت میں بھی ہو جلوت کا سماں، وحدت کو دوئی سے شاد کریں
یہ آرزوئیں ایجاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

دنیا کا تماشا دیکھ لیا، غمگین سی ہے، بے تاب سی ہے
امیّد یہاں اک وہم سی ہے، تسکین یہاں اک خواب سی ہے
دنیا میں خوشی کا نام نہیں، دنیا میں خوشی نایاب سی ہے
دنیا میں خوشی کو یاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

انتظار

سُنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں

بہار و کیف کی بدلی، اُتر آئے گی وادی میں
سُرور و نور کا کوثر چھڑک جائے گی وادی میں
نسیمِ بادیہ، منظر کو مہکائے گی وادی میں
شباب و حُسن کی بجلی سی لہرائے گی وادی میں
سُنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں

○

ابھی سے جاؤں اِدرِ وادی کے نظاروں سے کہہ آؤں
بچھا دیں فرشِ گُل وادی میں، گلزاروں سے کہہ آؤں
چھڑک دیں مستیاں پھولوں کی مہکاروں سے کہہ آؤں
کہ سلمیٰ، میری سلمیٰ نور برسائے گی وادی میں
سُنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں

○

سُنا ہے میری سلمیٰ رات کو وادی میں آئے گی
برائے سیر اس پھولوں کی آبادی میں آئے گی
غزالِ دشت بن کر رنگِ آزادی میں آئے گی
اور آکر نازنی بستی بسا جائے گی وادی میں
سُنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں

○

بہارِ وادیِ رنگیں کو یہ مژدہ سُنا آؤں
زمیں کو نکہتِ گلہائے رعنا سے بسا آؤں
اور اُس پر نازنیں کلیوں کا اک بستر بچھا آؤں
کہ وہ نازک بدن ہے، اور تھک جائے گی وادی میں
سُنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں

○

زمیں پر بھیج دے آج اے بہشت اپنی بہاروں کو
بچھا دے خاک پر اے آسماں اپنے ستاروں کو
خرام و رقص کا دے حکم فطرت، ابر پاروں کو
وہ بے خود چاند کی نظروں سے گھبرائے گی وادی میں
سُنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں

مرے آغوش میں ہوگا وہ جسمِ مرمریں اس کا
وہ اُس کے کاکلِ مشکیں، وہ روئے نازنیں اس کا
وہ رخسارِ حسیں اُس کے، وہ حُسنِ یاسمیں اس کا
وہ جس سے شوق کی دنیا کو مہکائے گی وادی میں
سُنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں

○

تمنا و حیا کی کش مکش کیوں کر مٹاؤں گا
میں اُس کے یاسمیں پیکر کو کیسے گدگداؤں گا
اور اُس کے لعلِ لب سے کس طرح رنگت چراؤں گا
وہ پھولوں اور ستاروں سے بھی شرمائے گی وادی میں
سُنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں

بدنام ہو رہا ہوں

فریادیٔ جفائے ایام ہو رہا ہوں
پامالِ جورِ بختِ ناکام ہو رہا ہوں
سرگشتۂ خیالِ انجام ہو رہا ہوں
بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں

بدنام ہو رہا ہوں
سلمٰی سے دل لگا کر
بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں
سلمٰی سے دل لگا کر، سلمٰی سے دل لگا کر

اُس حور وش کے غم میں دنیا و دیں گنوا کر — ہوش و حواس کھو کر، صبر و سکوں لٹا کر
بیٹھے بٹھائے دل میں، غم کی خلش بسا کر
ہر چیز کو بھلا کر
سلمٰی سے دل لگا کر
بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں

کہتی ہیں سب یہ کس کی تڑپا گئی ہے صورت
سلمٰی کی شاید اس کے من بھا گئی ہے صورت — اور اس کے غم میں اتنی مرجھا گئی ہے صورت
مرجھا گئی ہے صورت کمھلا گئی ہے صورت
سنولا گئی ہے صورت
سلمٰی سے دل لگا کر
بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں

پنگھٹ پہ جب کہ ساری ہوتی ہیں جمع آکر
گاگر کو اپنی رکھ کر، گھونگٹ اٹھا اٹھا کر — یہ قصہ چھیڑتی ہیں مجھ کو بتا بتا کر
سلمٰی سے باتیں کرتے دیکھا ہے اس کو جا کر

ہم نے نظر بچا کر
سلمیٰ سے دل لگا کر

بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں
راتوں کو گیت گانے جب مل کر آتی ہیں سب

تالاب کے کنارے دھومیں مچاتی ہیں سب   جنگل کی چاندنی میں منگل مناتی ہیں سب
تو میرے اور سلمیٰ کے گیت گاتی ہیں سب

اور ہنستی جاتی ہیں سب
سلمیٰ سے دل لگا کر

بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں
کھیتوں سے لوٹتی ہیں جب دن چھپے مکاں کو

تب راستے میں باہم وہ میری داستاں کو   دہرا کے چھیڑتی ہیں سلمیٰ کو میری جاں کو
اور وہ حیا کی ماری سی لیتی ہے زباں کو

کیا چھیڑے اس بیاں کو
سلمیٰ سے دل لگا کر

بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں
کہتی ہے رحم کھا کر یوں ایک ماہ طلعت

یہ شہری نوجواں تھا کس درجہ خوبصورت   آنکھوں میں بس رہی ہے اب بھی وہ پہلی رنگت
دو دن میں آہ کیا سے کیا ہو گئی ہے حالت

اللہ تیری قدرت
سلمیٰ سے دل لگا کر

بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں
اس شمع رو کا جب سے پروانہ بن گیا ہوں
بستی کی لڑکیوں میں افسانہ بن گیا ہوں   ہر ماہ وش کے لب کا پیمانہ بن گیا ہوں
دیوانہ ہو رہا ہوں، دیوانہ بن گیا ہوں
دیوانہ بن گیا ہوں
سلمیٰ سے دل لگا کر
بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں
ان کی زباں پہ میری جتنی کہانیاں ہیں
کیا جانیں کہ دل کی سب مہربانیاں ہیں   کمسن ہیں، بے خبر ہیں، اٹھتی جوانیاں ہیں
کیا سمجھیں، غم کے ہاتھوں کیوں سرگرانیاں ہیں
کیوں خوں فشانیاں ہیں
سلمیٰ سے دل لگا کر
بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں
ہر اک کے رحم کا یوں اظہار ہو رہا ہے
"بے چارے کو یہ کیسا آزار ہو رہا ہے   دیکھے تو کوئی جلنے بیمار ہو رہا ہے
کس درجہ زندگی سے بیزار ہو رہا ہے

ناچار ہو رہا ہے

سلمیٰ سے دل لگا کر"

بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں

اک پوچھتی ہے آکر "تم بے قرار کیوں ہو؟

کچھ تو ہمیں بتاؤ یوں دل فگار کیوں ہو؟ کیا روگ ہے کہو تو تم اشکبار کیوں ہو؟

دیوانے کیوں ہوئے ہو دیوانہ وار کیوں ہو؟

با حالِ زار کیوں ہو؟"

سلمیٰ سے دل لگا کر

بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں

جاؤں شکار کو گر با ہمرہانِ صحرا

کھیتوں سے گھورتی ہیں یوں دخترانِ صحرا بجلی کی روشنی کو جیسے میانِ صحرا

تاریک شب میں دیکھیں کچھ آہوانِ صحرا

حیرت کشانِ صحرا

سلمیٰ سے دل لگا کر

بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں

اک شوخ چھیڑتی ہے اس طرح پاس آ کر

"دیکھو ادھ جا رہی ہے سلمیٰ نظر بچا کر شرما کے مسکرا کر، آنچل سے منہ چھپا کر

جاؤ نا پیچھے پیچھے، دو باتیں کر لو جا کر

کھیتوں میں چھپ چھپا کر"
سلمیٰ سے دل لگا کر
بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں
گویا ہیں یوں حسد سے کچھ نازنیں نگاہیں
سلمیٰ کی بھا گئی ہیں کیوں دلنشیں نگاہیں؟ ان سے زیادہ دلکش ہیں یہ حسیں نگاہیں
القصہ ایک دل ہے سو خشمگیں نگاہیں
شوق آفریں نگاہیں
سلمیٰ سے دل لگا کر
بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں
اک شوخ تازہ وارد سسرال سے گھر آکر
سکھیوں سے پوچھتی ہے جس دم مجھے بتا کر "یہ کون ہے" تو ظالم کہتی ہیں مسکرا کر
"تم اس کا حال پوچھو سلمیٰ کے دل سے جا کر
یہ گیت اسے سنا کر"
سلمیٰ سے دل لگا کر
بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں

ہوسِ بازدید

تمہیں ستاروں نے بے اختیار دیکھا ہے / شریر چاند نے بھی بار بار دیکھا ہے

کبھی چمن میں گئی ہو تو مست پھولوں نے / نگاہِ شوق سے آئینہ وار دیکھا ہے

روپہلی چاندنی نے رات کو کھلی چھت پر / ادا سے سوتے ہوئے بار بار دیکھا ہے

بہارِ صبح کی رنگینیوں میں کھوئے ہوئے / نسیم نے تمہیں مستانہ وار دیکھا ہے

سنہری دھوپ کی کرنوں نے بام پر تم کو / بکھیرے گیسوئے مشکیں بہار دیکھا ہے

قریبِ شام تمہیں طائرانِ گلشن نے / ہزار بار سرِ لالہ زار دیکھا ہے

بہشتِ حسن کی تازہ کلی کے دھوکے میں / کلی نے بھی تمہیں دیوانہ وار دیکھا ہے

سنہرے پانی میں چاندی سے پاؤں لٹکائے / شفق نے تم کو سرِ جوئبار دیکھا ہے

ہمیشہ رات کو محوِ مطالعہ تم کو / نگاہِ شمع نے پروانہ وار دیکھا ہے

کبھی اٹھی ہو جو گیسو سنوارنے کے لیے / تو آئینہ نے تمہیں ہم کنار دیکھا ہے

کسی خیال میں کھوئے ہوئے ہمیشہ تمہیں / سحر نے محوِ گل و شاخسار دیکھا ہے

تمہاری خلوتِ معصوم نے ہزاروں بار / سرِ بیانو تمہیں نغمہ بار دیکھا ہے

گھٹا نے دامنِ کہسار میں تمہیں اکثر / اسیرِ زمزمۂ آبشار دیکھا ہے

عروسِ برق نے اپنا نقاب الٹ کے تمہیں / غریقِ مستیِ ابرِ بہار دیکھا ہے

نسیمِ باغ نے زیب النسا سمجھ کے کبھی — تمہیں بہ گل کدۂ شالامار دیکھا ہے
غرض مظاہرِ فطرت نے ہر طرح تم کو — ہزار بار نہیں، لاکھ بار دیکھا ہے
مگر مری نگہِ شوق کو شکایت ہے — کہ اُس نے تم کو فقط ایک بار دیکھا ہے

دکھا دو ایک جھلک اور بس نگاہوں کو
دوبارہ دیکھنے کی ہے ہوس نگاہوں کو

ننّھا قاصد

ترا ننّھا سا قاصد، جو ترے خط لے کر آتا تھا
نہ تھا معلوم اُسے، کس طرح کے پیغام لاتا تھا
سمجھ سکتا نہ تھا وہ خط میں کیسے راز پنہاں ہیں
حروفِ سادہ میں کس حشر کے انداز پنہاں ہیں
اُسے کیا علم ان رنگیں لفافوں میں چھپا کیا ہے
کسی مہوش کا ان کے بھیجنے سے مدعا کیا ہے

○

مگر مجھ کو خیال آتا تھا اکثر اس زمانے میں
کہ اُس کی حیرتِ طفلی ہی کیوں گم اُس فسانے میں

وہ بااِیں کم سنی، کیا یہ نہ دل میں سوچتا ہوگا
کہ باجی نے ہماری اپنے خط میں کیا لکھا ہوگا؟
اور آخر وہ اسی کو نامہ لکھ کر بھیجتی کیوں ہیں؟
کبھی بھیجا تو بھیجا لیکن اکثر بھیجتی کیوں ہیں؟
وہ پہلے سے زیادہ بھائی کو کیوں پیار کرتی ہیں؟
لفافہ دے کے لطفِ خاص کا اظہار کرتی ہیں
پھر ایسے اجنبی پر اس کی باجی مہرباں کیوں ہیں؟
اگر ہیں بھی تو گھر والوں سے یہ باتیں نہاں کیوں ہیں؟
اور اُس کے شبہے کی، اس سے بھی تو تائید ہوتی ہے
چھپا کر خط کو لے جانے کی کیوں تاکید ہوتی ہے؟
یہ نو خیز اجنبی جانے کہاں سے اکثر آتا ہے
جب آتا ہے تو باجی کی طرح خط لکھ کے لاتا ہے
عزیزوں کی طرح یہ کیوں مکاں میں آ نہیں سکتا؟
جب اُس سے پوچھتا ہے وہ اُسے سمجھا نہیں سکتا
کھلونے دے کر اُس کو مسکرا دیتا ہے وہ اکثر
اور اک ہلکا سا تھپڑ بھی لگا دیتا ہے وہ اکثر

○

ترے قاصد کے یہ انکار دل کو گدگداتے تھے
اور اپنے بھول پن سے میرے جذبوں کو ہنساتے تھے
نہیں موقوف انہی ایام پر جب بھی خیال آیا
تصور تیرے بعد اُس کا بھی نقشہ سامنے لایا
مگر آج اس طرح دیکھا ہے وہ نقشِ حسیں ہم نے
کہ رکھ دی خاکِ حیرت پر محبت کی جبیں ہم نے
وہی ننھا سا قاصد نوجواں ہو کر ملا مجھ کو
زمانے کے تغیر نے پریشاں کر دیا مجھ کو
جنونِ ابتدائے عشق نے کروٹ سی لی دل میں
پس از مدت یہ لیلیٰ آ گئی پھر اپنے محمل میں
ترے قاصد سے ملتے وقت مجھ کو شرم آتی تھی
مگر اُس کی نگاہوں میں شرارت مسکراتی تھی

○

شرارت کا یہ نظارہ مری حیرت کا ساماں تھا
کہ اس پردہ کے اندر تیرا رازِ عشق عریاں تھا

برکھا رُت

آسماں پر چھا رہا ہے ابر پاروں کا ہجوم　　　نو بہاروں کا ہجوم

آہ یہ رنگین آوارہ نظاروں کا ہجوم　　　کوہساروں کا ہجوم

بدلیاں ہیں یا کسی کے بھولے بسرے خواب ہیں　　　بے خود و بیتاب ہیں

یا ہوا پر تیرتا ہے رود باروں کا ہجوم　　　آبشاروں کا ہجوم

پھرتی ہیں آوارہ متوالی گھٹائیں اس طرح　　　اور ہوائیں اس طرح

جھومتا پھرتا ہو جیسے میگساروں کا ہجوم　　　بادہ خواروں کا ہجوم

وادیِ گنگا ہے، برکھا رُت ہے، کالی رات ہے　　　رات ہے برسات ہے

اور فضا میں تیرنے والے نظاروں کا ہجوم　　　نشّہ زاروں کا ہجوم

نیلگوں کیا اُفق میں پریاں پھیلائے ہوئے　　　بال بکھرائے ہوئے

یا اُمنڈ آیا ہے ساون کی بہاروں کا ہجوم　　　ابر پاروں کا ہجوم

ننھی ننھی بوندیں گرتی ہیں حجابِ ابر سے　　　یا نقابِ ابر سے

چھن رہا ہے قطرے بن بن کر ستاروں کا ہجوم　　　برق پاروں کا ہجوم

یہ گھٹائیں ہیں کہ خوابوں کے سفینے ہیں رواں　　　بے قرینے ہیں رواں

بادبانوں میں چھپائے چشمہ ساروں کا ہجوم　　　جوئباروں کا ہجوم

تجلی ہے یا نور کی زنجیر لہرائی ہوئی — پیچ و خم کھائی ہوئی
یا خمیدہ مرمریں پھولوں کے ہاروں کا ہجوم — اور ستاروں کا ہجوم

یہ سماں بجلی کا، یہ مہتاب کی سی وادیاں — خواب کی سی وادیاں
نشے میں بھیگا ہوا یہ سبزہ زاروں کا ہجوم — یہ بہاروں کا ہجوم

کوہساروں میں خوشی کی بستیاں آباد ہیں — مستیاں آباد ہیں
چار سو بکھرا پڑا ہے سبزہ زاروں کا ہجوم — مرغزاروں کا ہجوم

یوں نظر آتے ہیں کہسارِ مسوری دور سے — مست سے مخمور سے
جوں سمندر سے جزیروں کی قطاروں کا ہجوم — سبزہ زاروں کا ہجوم

یہ سفر، یہ رات، یہ برسات اور پھر ہم سفر — الاماں والحذر
ایک حسنِ یاسمیں، رنگیں بہاروں کا ہجوم — ماہ پاروں کا ہجوم

آہ یہ مخمور آنکھیں مست سی بے خواب سی — نیند میں بے تاب سی
جن سے چھلکا پڑ رہا ہے سحر پاروں کا ہجوم — فتنہ زاروں کا ہجوم

آہ یہ شاداب چہرہ اور یہ حسنِ نازنیں — اُف یہ جسمِ یاسمیں
جیسے یک جا ہو سمٹ کر نو بہاروں کا ہجوم — چاند تاروں کا ہجوم

یہ سہانے منظر اختر مدتوں یاد آئیں گے — مدتوں تڑپائیں گے
آہ یہ رات، اُف یہ مستانہ نظاروں کا ہجوم — یہ بہاروں کا ہجوم

شامِ بنگال

گنگناتی ہوئی، ہنستی ہوئی، اٹھلاتی ہوئی
شامِ بنگال اٹھی زلفوں کو بکھراتی ہوئی

چشمِ میگوں میں لیے خوابِ زلیخا کے ہجوم
چاکِ دامانِ یوسف کی قسم کھاتی ہوئی

یادِ ایام کے جذبوں کو جگا کر دل میں
پھول کی طرح مری یاد کو مہکاتی ہوئی

بھر کے دامن میں حسینوں کا لہکتا ہوا نور
قصۂ طور کو ہر گام پہ دہراتی ہوئی

سارے غم بھول کے، اک عالمِ سرمستی میں
قہقہہ بن کے ہر اک ہونٹ پہ لہراتی ہوئی

خاکِ کلکتہ پہ برسا کے شمیم و مستی
میری گزری ہوئی راتوں کی قسم کھاتی ہوئی

تازہ ہو کر مرے خوابوں میں ستاروں کی طرح
بھولے بسرے ہوئے کچھ خواب سے دکھلاتی ہوئی

ہر قدم پہ نئے جلووں کو نمایاں کر کے
ہر قدم پہ نئے تجانے سے برساتی ہوئی

آ کے پہلو میں مرے یوں لگی جیسے کوئی حور
بسترِ گل سے اٹھے صبح کو شرماتی ہوئی

کلیاں

نہ پھولوں کی تمنا ہے، نہ گلدستوں کی حسرت ہے
مجھے تو کچھ انہی بیمار کلیوں سے محبت ہے

ابھی اُلٹا نہیں بادِ بہاری نے نقاب ان کا
ابھی محفوظ ہے اک خلوتِ رنگیں میں خواب ان کا
ابھی سرمستیوں میں رات دن سونے کی عادت ہے
مجھے تو کچھ انہی بیمار کلیوں سے محبت ہے
ابھی لوٹا نہیں سورج کی کرنوں نے حجاب ان کا
ابھی رسوا نہیں ہے گل فروشوں میں شباب ان کا
ابھی چھائی ہوئی دوشیزگی کی سادہ رنگت ہے
مجھے تو کچھ انہی بیمار کلیوں سے محبت ہے
یہ ننھی ننھی پریاں ہیں بہارِ بوستانی کی
یہ پیاری پیاری حوریں ہیں بہشتِ گلفشانی کی
شمیم آبادِ گلشن میں انہی ان کی حکومت ہے
مجھے تو کچھ انہی بیمار کلیوں سے محبت ہے
ہوائیں جھولتے رہتے ہیں ہر دم آشیاں ان کے
ہیں دو دو پتیوں کی گود میں قائم مکاں ان کے
مکاں یا آشیاں جو کچھ بھی ہے نکہت ہی نکہت ہے
مجھے تو کچھ انہی بیمار کلیوں سے محبت ہے

خزاں جن کو چرا کر لے گئی تھی اک زمانے میں
صبا لے آئی پھر موتی وہ گلشن کے خزانے میں
چمن میں ہر کلی ساون کی اک رنگیں امانت ہے
مجھے تو کچھ انہی بیمار کلیوں سے محبّت ہے

یہ گہری چاندنی میں جھومتی ہیں شاخساروں پر
کہ کچھ چینی کی گڑیاں ناچتی ہیں سبز تاروں پر
یہ عالم ہے کہ پیشانی کو سجدوں کی ضرورت ہے
مجھے تو کچھ انہی بیمار کلیوں سے محبّت ہے

کوئی دوشیزہ جب آغوشِ بیماری میں سوتی ہے
تو صحت سے کہیں بڑھ کر حسیں معلوم ہوتی ہے
یونہی پھولوں میں اور کلیوں میں بھی فرقِ لطافت ہے
مجھے تو کچھ انہی بیمار کلیوں سے محبّت ہے

بہارستان کے مندر کی، ان کو دیویاں کہیے
جو گل کو کرشن کہیے، ان کو اس کی گوپیاں کہیے
کوئی جانِ ملاحت ہے، کوئی کانِ صباحت ہے
مجھے تو کچھ انہی بیمار کلیوں سے محبّت ہے

کوئی چھولے اگر ان کو تو یہ کمھلا کے رہ جائیں
حیا میں اس قدر ڈوبیں کہ بس مرجھا کے رہ جائیں
ابھی الھڑ پنے کے دن ہیں، شرمانے کی عادت ہے
مجھے تو کچھ انہی ہمیار کلیوں سے محبّت ہے

یہ جب تک یوں اچھوتی رہتی ہیں، ہمیار رہتی ہیں
یونہی مدہوش رہتی ہیں، یونہی سرشار رہتی ہیں
غرض آٹھوں پہر ان کی یہی مستانہ حالت ہے
مجھے تو کچھ انہی ہمیار کلیوں سے محبّت ہے

مرا بس ہو تو اختر میں انہی کا رنگ ہو جاؤں
ہمیشہ کے لیے ان جمپئی پردوں میں سو جاؤں
مجھے ان کی رسیلی گود میں مرنے کی حسرت ہے
مجھے تو کچھ انہی ہمیار کلیوں سے محبّت ہے

تیتری

یہ تیتری ہے یا کوئی رنگِ پریدہ ہے — بوئے چکیدہ ہے
آغوشِ گل میں، یا کوئی نقشِ رمیدہ ہے — عکسِ کشیدہ ہے
اُٹھّے تو ایک بوسۂ رقصیدہ سامنے — یا شیدہ سامنے

بیٹھے تو ایک لذتِ خوابیدہ سامنے   دامن کشیدہ ہے
جوئے صبا میں ہلکا سا طوفانِ رنگ و بُو   ہیجانِ رنگ و بُو
دوشِ فضا پہ چھوٹا سا نیسانِ رنگ و بُو   جو صف کشیدہ ہے

اک پُر بہار نقش ہے عشرت کے خواب کا   عہدِ شباب کا
یا برگِ گل پہ لرزشِ جامِ شراب کا   عکسِ رمیدہ ہے
ننھی سی اک شعاع ہے طورِ کلیم پر   سطحِ نسیم پر
رقاصۂ بہار کا فرشِ شمیم پر   رقصِ پریدہ ہے

ابھرا ہوا سا عکس ہے رنگیں غبار کا   کیف و خمار کا
یا شاخسارِ گل پہ عروسِ بہار کا   حُسنِ رمیدہ ہے
اک نوعروس کی نگہِ انفعال ہے   شرمِ وصال ہے
یا اک شعاع پرتوِ قوسِ ہلال ہے   اور نودمیدہ ہے

رنگت ہے پھول کی سی مگر پھول سے جُدا   ہر پھول سے جُدا
یا پنکھڑی ہے پھول کی پر پھول سے جُدا   خود آفریدہ ہے
وہ اک حسین نغمہ جسے بھول جائے دل   برسوں نہ پائے دل
پھر یک بیک کبھی جسے یوں ڈھونڈ لائے دل   جوں ناشنیدہ ہے

بچپن کا کوئی خواب ہے رقصاں فضاؤں میں   بدلی کی چھاؤں میں
بیتے ہوئے دنوں کا سماں ہے ہواؤں میں   اور غم کشیدہ ہے

اک حسنِ کار کا کوئی رنگیں خیال ہے
مستِ کمال ہے

یا یہ کسی حسینہ کا شوقِ وصال ہے
جو نو رسیدہ ہے

اک خوابِ نو مصورِ رنگیں طراز کا
صورت نواز کا

یا ایک مطربہ کے دلِ پُر گداز کا
لحن پریدہ ہے

گذرے ہوئے دنوں کی کوئی دل گداز یاد
رنگیں طراز، یاد

یا کیفِ عشق کی کوئی پُر سوز و ساز، یاد
تلخی چشیدہ ہے

اُمّید ہے یہ ایک غریب الدیار کی
حسرت شعار کی

فکرِ خزاں میں لالۂ رخِ نو بہار کی
آہِ کشیدہ ہے

موجِ شراب کی اسے اک تھرتھری کہوں
ننھی پری کہوں

یا موسمِ بہار کی اک تیتری کہوں
جو، آرمیدہ ہے

نغمۂ سحر

سُنو یہ کیسی آواز آ رہی ہے
کوئی دیہاتی لڑکی گا رہی ہے

سحر کے دھندلے دھندلے منظروں کو
شرابِ نغمہ سے نہلا رہی ہے

اُٹھی ہے شاید آٹا پیسنے کو
کہ چکّی کی صدا بھی آ رہی ہے

غموں سے چُور اپنے ننھے دل کو
ترانہ چھیڑ کر بہلا رہی ہے

فضا پر، بستیوں پر، جنگلوں پر
دھواں دھار ایک بدلی چھا رہی ہے

چھما چھم مینہ کی بوندیں پڑ رہی ہیں
کہ ساون کی پری کچھ گا رہی ہے

نئے بھیگے ہوئے سبزے کی خوشبو
ہوا کے ساتھ اڑ کر آ رہی ہے

صبا کے مست جھونکوں کے اثر سے
خوشی سی دل میں امڈی جا رہی ہے

مگر ہے غم کی تاثیر اس خوشی میں
گزشتہ زندگی یاد آ رہی ہے

کوئی یاد آہ! اک غم دیدہ سی یاد
سمے بچپن کا پھر دکھلا رہی ہے

گلِ خودرو کی غم انگیز خوشبو
قریبی وادیوں سے آ رہی ہے

ہوا کی سرسراہٹ ہے کہ فطرت
پرانی زندگی دہرا رہی ہے

ادھر بادل کی خوف انگیز آواز
فضا کو نیند سے چونکا رہی ہے

یہ بادل ہیں کہ ہیں ساون کے سپنے
ہوا جن کو اڑا کر لا رہی ہے

یہ بجلی ہے کہ اک مرمر کی ناگن
دھوئیں کی جھیل پر لہرا رہی ہے

یہ بوندیں ہیں کہ بجلی آسماں سے
ستارے توڑ کر برسا رہی ہے

مگر وہ غم زدہ معصوم لڑکی
برابر گیت گائے جا رہی ہے

کچھ ایسا ناتواں نغمہ ہے گویا
کوئی ننھی کلی مرجھا رہی ہے

ہوا، ٹھنڈی ہوا بھرتی ہے آہیں
فضا، دھندلی فضا تھرا رہی ہے

گھروں پر، کھیتیوں پر، کیاریوں پر
اداسی ہی اداسی چھا رہی ہے

نہ جانے کیا اثر ہے اس صدا میں
کہ خود فطرت بھی بہکی جا رہی ہے

یہ گھر سسرال ہوگا شاید اس کا
جبھی ماں باپ کی یاد آ رہی ہے

کبھی مصروف ہے آہ و فغاں میں　　کبھی غمگین سے میں گا رہی ہے

"یہ برکھا رُت بھی بیتی جا رہی ہے!

ہوا جو گاؤں کو مہکا رہی ہے　　مرے میکے سے شاید آ رہی ہے

یہ برکھا رُت بھی بیتی جا رہی ہے

گھٹا کی اُودی اُودی چنریوں سے[۱]　　مری سکھیوں کی بُو باس آ رہی ہے

یہ برکھا رُت بھی بیتی جا رہی ہے

مجھے لینے نہ آئے اچھے بابل　　تمہاری یاد آفت ڈھا رہی ہے

یہ برکھا رُت بھی بیتی جا رہی ہے

مری امّاں کو ہو اس کی خبر کیا　　کہ چمپیا اس جگہ گھبرا رہی ہے

یہ برکھا رُت بھی بیتی جا رہی ہے

نہ لی بھیّا نے بھی سدھ بدھ ہماری　　جہاں سے چاہ اُٹھتی جا رہی ہے

یہ برکھا رُت بھی بیتی جا رہی ہے

ہوا کی پنکھیا جھل جھل کے بجلی　　مرے دل کی لگی بھڑکا رہی ہے

یہ برکھا رُت بھی بیتی جا رہی ہے

بھلا کیوں کر تھمیں آنسو کہ جی پر　　اُداسی کی بدریا[۲] چھا رہی ہے

یہ برکھا رُت بھی بیتی جا رہی ہے

---

[۱] راجستانی رنگین دوپٹہ　[۲] بادل

نئے پھولوں سے جنگل بس چلے ہیں — مرے من کی کلی کمھلا رہی ہے
یہ برکھا رت بھی بیتی جا رہی ہے

کوئی اس باؤلی بدلی سے پوچھے — پرائے دیس میں کیوں چھا رہی ہے
یہ برکھا رت بھی بیتی جا رہی ہے

جو بجلی کھیلتی تھی مجھ سے اک دن — وہی آنکھیں مجھے دکھلا رہی ہے
یہ برکھا رت بھی بیتی جا رہی ہے

نہیں کھیتوں میں ساون کی گرڑیاں[۱] — ہماری آنکھ خوں برسا رہی ہے
یہ برکھا رت بھی بیتی جا رہی ہے

گھٹا ہے یا کوئی بچھڑی سہیلی — مرے گھر سے سندیسہ لا رہی ہے
یہ برکھا رت بھی بیتی جا رہی ہے

گیا پینگیں بڑھانے کا زمانہ — وہ امریوں پہ کوئل گا رہی ہے
یہ برکھا رت بھی بیتی جا رہی ہے"

یونہی وہ اپنی غمگیں راگنی سے — در و دیوار کو تڑپا رہی ہے
سیاہی اڑتی جاتی ہے افق سے — عروسِ صبح بڑھتی آ رہی ہے
شوالے میں گجر بھی جاگ اٹھا — ٹھناٹھن ٹھن کی آواز آ رہی ہے
کوئی چڑیا نکل کے گھونسلے سے — گھنے جنگل میں منگل گا رہی ہے

۱؎ بیر بہوٹیاں

کوئی بکری کہیں کرتی ہے "میں میں" | کوئی پپیہا کہیں چلا رہی ہے

ایسے سن سن کے کب تک سر دھنو گے

بس اخترؔ سو نے دو نیند آ رہی ہے

رویائے شیراز

شب کو یوں جذبِ تصوّر نے دکھائی پرواز | کھینچ کے آنکھوں میں چلی آئی بہشتِ شیراز

نونہالانِ چمن جھوم رہے تھے جیسے | مستیٔ مے سے بہکتے ہوں بتانِ طنّاز

چار سُو عطر فشاں، موجِ نسیمِ سحری | چار سُو رقص کناں نکہتِ گل کی پرواز

وہ درختوں کی ادا، حسن پہ تصدق فردوس | وہ پرندوں کی صدا، حسن پہ قدر النغمہ ساز

نگہِ شوق ابھی سیراب ہوئی تھی نہ ذرا | کہ تصوّر کی کرامات نے بدلا انداز

دیکھتا کیا ہوں کہ اک کُنجِ بہار افشاں میں | محوِ حافظؔ ہے خوش الحانی سے یوں نغمہ طراز

"اے کہ خاموش نشینی بہ بہاراں عجب است

خیز و در کاسۂ زر آبِ طربناک انداز"

مسکراتے ہوئے لہجے میں سُنی جب یہ صدا | آگے بڑھ کر یہ کہا میں نے پس از عرضِ نیاز

اے کہ ہے ذہن ترا اوجِ حقیقت کو محیط | اے کہ ہے فکرِ رسا تیری ثریا پرواز

تیری نظروں میں ہیں بے پردہ کُل اسرارِ حیات | نغمے کے ہمہے سے تا بہ رگِ پردۂ ساز

لیکن اک نکتہ سمجھ میں نہیں آیا اب تک — چہرۂ حسنِ حقیقت سے اُٹھا پردۂ راز
کبھی کہتا ہے کہ مرنے سے نہیں ہم کو مفر — یہ حیاتِ دو سہ روزہ نہیں سرمایۂ ناز
کبھی کہتا ہے کہ ہنگامِ عمل کو نہ گنواؤ — عرصۂ دہر میں ہمت کے دکھاؤ اعجاز
اک طرف تو یہ صلا ہے کہ ہے دنیا فانی — بزمِ ہستی ہے اک افسانۂ محمود و ایاز
اک طرف جوشِ نصیحت کی ہے ہر دم تاکید — کہ دریں عرصہ گہِ سعی تو طفلانہ متاز
کوئی نغمہ نہیں یوں تو ترے الہام سے کم — لیکن اس رازِ تفاوت کا ہوں میں شکوہ طراز
یعنی مرنا ہے جب اک دن تو عمل سے کیا کام — موت کا خوف ہو کیوں فکرِ عمل کا ہمساز

سن کے یہ شوخ بیانی مری خواجہ نے کہا
"تو حریفِ غمِ اسرار نہ ای ہرزہ متاز!"

موت کے ذکر سے مقصود فقط اتنا ہے — کہ نظر میں رہے ہر وقت مآلِ آغاز
یعنی اک روز جب اس گھر سے چلے جانا ہے — جب کہ مٹ جانے کو ہے رنگِ طلسماتِ مجاز
تو یہ بہتر ہے کہ سب حوصلے دل کے نکلیں — ہمّت و سعی سے انسان ہو جہاں میں ممتاز
زندہ قوموں کی فنا بھی ہے بقا کی ہم رنگ — کیونکہ یاد ان کی ہے دنیا میں عمل کی ہمراز
لوحِ ایام مٹا دیتی ہے اس قوم کا نام — جس کے دل میں نہ ہوا احساسِ عمل درد نواز
موت برحق ہے مگر اُس سے فقط اس لیے ڈر — کہ نہ کر دے کہیں آئینۂ فرصت کو گداز

"عاقبت منزلِ ما وادیِ خاموشان است
حالیہ غلغلہ در گنبدِ افلاک انداز!"

معصومیت

لیلئ شب کے پریشان ہیں گیسوئے سیاہ
شورشِ آبادِ جہاں تیرہ و تار
نشہ برساتی ہے مدہوش ستاروں کی نگاہ
نیند میں غرق ہے سارا سنسار
چارسو چھا گئی خاموشی و ظلمت کی سپاہ
نور و آہنگ نے لی راہِ فرار
نیند کی تیغ سے جاگ اٹھا ہے خوابیدہ گناہ
شیرِ خونخوار ہو جیسے بیدار

○

رات کے پردوں میں آباد سیہ خانے ہیں
تیرہ و تار مہیب اور خونریز
ذوقِ عصیاں کے بھٹکتے ہوئے میخانے ہیں
بحرِ ظلمات میں طوفان انگیز
معصیت کاری کے بپھرے ہوئے مستانے ہیں
رُخِ رندِ تشنگی سے گرمِ ستیز
ان کے فولاد گوں پنجوں میں جو پیمانے ہیں
خونِ عفت سے ہیں یکسر لبریز

○

چارسو موجزن اک حشرِ سیہ کاری ہے
تند، ہنگامہ فگن، طوفانی
بزمِ انسانی پہ اک ابرِ گنہ طاری ہے
قہر گوں، شعلہ فشاں، ہیجانی
ہر طرف فسق کا اک سیلِ بلا جاری ہے
شورش انگیز و پُر از طغیانی
محشرستانِ سیہ مستی و سرشاری ہے
مست ہے جلوہ گہ انسانی

یہ سماں دیکھ کے اک حور وہاں آتی ہے — مشک بو زلفوں کو بکھرائے ہوئے
اور نظر اس ہوس آباد پہ دوڑاتی ہے — فرطِ تقدیس سے گھبرائے ہوئے
عالمِ یاس میں مبہوت سی رہ جاتی ہے — اشکِ غم آنکھوں میں چھلکائے ہوئے
چاند کی روشنی اک نشہ سا برساتی ہے — سینۂ صاف پہ لہرائے ہوئے

○

فلکِ حسن کا گم گشتہ ستارہ کہیے — جس سے روشن ہے فضائے صحرا
جنتِ قدس کا آوارہ نظارہ کہیے — جس سے رنگیں ہے ہوائے صحرا
بحرِ رعنائیِ فطرت کا کنارہ کہیے — جس سے ہے مست ادائے صحرا
جذبِ موسیقی کا اک نقشِ دلآرا کہیے — نغمۂ روح فزائے صحرا

○

اک فرشتوں کے سے لہجے میں وہ کرتی ہے خطاب — (آہ! وہ لہجہ حزین و غم ناک)
"کہ تم اے راہزنِ عفت و آوارہ شباب — سرخوش و بے خود و مست و بیباک"
"تم جو عفت کا لٹاتے ہو یہ دُرِّ نایاب — کر کے دامانِ تقدس کو چاک"
"یہ وہ جوہر ہے جسے ہے رشکِ نجوم و مہتاب — اور حیرت گہِ حسنِ افلاک"

○

"ہاں یہ اک جذبۂ فطرتِ ربانی ہے — اور دنیا کی تمناؤں سے بری"
"عالمِ قدس کا اک جوہرِ نورانی ہے — روشن از جلوۂ نجمِ سحری"

"اس گتہ زار میں ہر دلِ انسانی ہے — روحِ صد مریمی حور و پری"
"روحِ قدرت کا یہ اک جلوۂ عرفانی ہے — یا الٰہیّتِ ذوقِ بشری"

○

"یہ وہ نشّہ ہے کہ ایسا کسی صہبا میں نہیں — روحِ کیفیّتِ صہبا کی قسم"
"یہ وہ موتی ہے کہ ایسا کسی دریا میں نہیں — قعرِ تاریکیٔ دریا کی قسم"
"یہ وہ تابش ہے جو رخسارِ ثریّا میں نہیں — نورِ رخسارِ ثریّا کی قسم"
"یہ وہ لذّت ہے کہ جو الفتِ سلمیٰ میں نہیں — جذبۂ الفتِ سلمیٰ کی قسم"

○

"ذرّے ذرّے میں ہے اک روحِ حقیقت مستور — اور ہر ذرّے کی قیمت ہے وہی"
"سینۂ شمع میں ہے سوزِ محبت مستور — شمعِ پُرسوز کی فطرت ہے وہی"
"غنچے کے دل میں ہے اک جذبۂ نکہت مستور — غنچے کی سربستہ صورت ہے وہی"

○

"مہِ تابندہ جو محرومِ لطافت ہو جائے — نام اس کا مہِ تاباں نہ رہے"
"روشنیٔ صبحِ درخشاں کی جو غارت ہو جائے — صبح، پھر صبحِ درخشاں نہ رہے"
"شام سے دور اگر شام کی رنگت ہو جائے — شام، شامِ شفق افشاں نہ رہے"
"گر جوانی یونہی بیگانۂ عفت ہو جائے — زینتِ پیکرِ انساں نہ رہے"

○

"ساز کے پردے میں بے تاب گر آواز نہ ہو — ساز پھر ساز نہ کہلائے کبھی"
"دلِ نکہت میں اگر جذبۂ پرواز نہ ہو — صحنِ گلشن کو نہ مہکائے کبھی"
"گل میں گر ذوقِ نمو پردہ بر انداز نہ ہو — گل نگاہوں کو نہ للچائے کبھی"
"گر جوانی میں بھی تقدیس کا انداز نہ ہو — وہ جوانی نہ نظر آئے کبھی"

○

"مئے رنگیں سے اگر نشۂ و لذت چھن جائے — سادہ پانی ہے وہ یا موجِ شراب"
"ماہِ تاباں سے اگر نور و لطافت چھن جائے — تودۂ خاک ہے وہ یا مہتاب"
"گلِ رعنا سے جو رنگینی و نکہت چھن جائے — سوکھی پتی ہے وہ یا برگِ گلاب"
"جس جوانی سے کہ رنگینیِ عفت چھن جائے — اشکِ تلخی ہے وہ یا نوشِ شباب"

○

"الغرض فلسفۂ ذوقِ جوانی یہ ہے — کہ جوانی نہ لٹائی جائے"
"مئے پارینہ کی خوبی کی نشانی یہ ہے — مدتوں تک وہ چھپائی جائے"
"عفت اور اس کے مظاہر کی کہانی یہ ہے — شاعروں کو نہ سنائی جائے"
"مذہبِ شعر کی الہام فشانی یہ ہے — معصیت خوب بڑھائی جائے"

○

"کب تک؟ اے گروہ! یہ عالمِ غفلت کب تک؟ — اور یہ نفس پرستی تا چند؟"
"موجۂ خوں میں کہو دورۂ وحشت کب تک؟ — دل میں یہ جذبۂ پستی تا چند؟"

"روح آلودۂ تاریکیِ ذلت کب تک؟ — اور یہ جذبات کی مستی تا چند؟"
"یہ شباب اور یہ بربادیٔ عفت کب تک؟ — ہاں! گناہوں کی یہ پستی تا چند؟"

○

"روح کے گل کدے ویران ہوئے جاتے ہیں — شیطنت کاری کے سینے مسکن"
"دل کے شورش کدے سنسان ہوئے جاتے ہیں — اور جذباتِ صفا کے مدفن"
"ولولے خیر کے بے جان ہوئے جاتے ہیں — اور منزل گہِ صد اہرمن"
"جو تھے انسان وہ حیوان ہوئے جاتے ہیں — آہ! او سفلگیٔ چرخِ کہن"

○

"آئے گا ایک دن آئے گا کہ شرماؤ گے تم — اور میں ہاتھوں سے نکل جاؤں گی"
"عالمِ یاس میں میرے لیے گھبراؤ گے تم — اور میں صورت بھی نہ دکھلاؤں گی"
"پچھلی بدذوقیوں کو ذہن میں جب لاؤ گے تم — شرم بن کر تمہیں شرماؤں گی"
"یاد کر کے مجھے پھر روؤ گے، پچھتاؤ گے تم — ہیں مگر ہاتھ نہیں آؤں گی"

ارواحِ معصوم

نگاہوں میں فرشتوں کی مسرت تھرتھراتی ہے — لبوں پہ ننھی کلیوں کی لطافت مسکراتی ہے
وہ موسیقی جو آوارہ تھی جنت کی بہاروں میں — زباں پر ان کی موجِ کیف بن کر گنگناتی ہے
وہ نکہت جو سما سکتی نہیں پھولوں کے دامن میں — وہ ان شاداب پھولوں کی جبیں پہ لہلہاتی ہے

وہ تابانی کہ طوفاں زیب ہے تاروں کی شعاعوں میں
سیہ آنکھوں میں ان کی بن کے بجلی جگمگاتی ہے

وہ شادابی جو پوشیدہ ہے روحوں کے تبسم میں
لبوں پر ان کے موجِ رنگ بن کر جھلملاتی ہے

وہ روحانی لطافت جس کو کھو بیٹھی ہے یہ دنیا
ابھی ان کے تبسم سے جھلک اپنی دکھاتی ہے

بہارستانِ طفلی کی یہ وہ معصوم روحیں ہیں
جنھیں فطرت خود اپنے دل کی گودی میں کھلاتی ہے

اے سرزمین گجرات

اے سرزمینِ گجرات! اے خلد زارِ اُلفت
پھولوں میں تیرے رقصاں، روحِ بہارِ الفت
تیرا ہر ایک ذرہ، ہے رازدارِ الفت

اے یادگارِ اُلفت
اے سرزمینِ گجرات

حسن و حجاب کا اک گہوارہ کہیے تجھ کو
شعر و شباب کا اک شہپارہ کہیے تجھ کو
فطرت کا ایک رنگیں نظارہ کہیے تجھ کو

گل پارہ کہیے تجھ کو
اے سرزمینِ گجرات

اے سرزمینِ گجرات، تو کانِ عاشقی ہے
پنجاب کے بدن میں، تو جانِ عاشقی ہے
ہاں جانِ عاشقی ہے، ارمانِ عاشقی ہے
ایمانِ عاشقی ہے
اے سرزمینِ گجرات

وہ سوہنی مہینوال، وہ عشق باز تیرے
دورِ عاشقی کے آوارہ راز تیرے
سوز و گداز سے وہ، لبریز ساز تیرے
نغمہ طراز تیرے
اے سرزمینِ گجرات

افسانۂ حزیں ہے، رسوائے عام جن کا
دنیائے عاشقی میں زندہ ہے نام جن کا
آنسو کی طرح چھلکا، الفت کا جام جن کا
ناکام جن کا
اے سرزمینِ گجرات

ماتم سرا ہے جن کے غم میں چناب اب تک
بیتاب، جن کی خاطر ہے ماہتاب اب تک

اور جن کو ڈھونڈتی ہے ہر موجِ آب اب تک

چشمِ حباب اب تک

اے سرزمینِ گجرات

تیری ہی خاک، اُن کا گہوارۂ حسیں تھی

تیری فضا ہی اُن کا آغوشِ نازنیں تھی

تیرے ہی در پہ اُن کی خاک آشنا جبیں تھی

اور سجدہ آفریں تھی

اے سرزمینِ گجرات

آنکھوں کے سامنے ہو، رودِ چناب جس دم

مصروفِ نور پاشی، ہو ماہتاب جس دم

اور دورِ جلوہ گر ہو پہنائے آب جس دم

با اضطراب جس دم

اے سرزمینِ گجرات

اُس دم مرے تصوّر، ہم رنگِ خواب ہو کر

لہراتے ہیں اُفق پر امواجِ آب ہو کر

کرتے ہیں رقص، عکسِ صہبائے ناب ہو کر

کیفِ شراب ہو کر

اے سرزمینِ گجرات

آتی ہے سوہنی جب دریا کے پار ہونے
عاشق کی حسرتوں پر، جا کر نثار ہونے
طوفاں کی شورشوں کا بے بس شکار ہونے
ماتم گسار ہونے
اے سرزمین گجرات

دریا پہ ہیں پریشاں، وہ دل گداز نغمے
وہ سوزِ عاشقی کے، شعلہ طراز نغمے
نغمے، وہ مستِ کیفِ عرضِ نیاز نغمے
پُرسوز و ساز نغمے
اے سرزمینِ گجرات

موجوں کی دھیمی دھیمی آواز آ رہی ہے
یا روح سوہنی کی دریدہ گا رہی ہے
اور دردِ عاشقی کے نغمے سُنا رہی ہے
آنسو بہا رہی ہے
اے سرزمینِ گجرات

دنیائے عاشقی پر احساں ہیں تیرے اب تک
حُسن آفرینِ بہشتی میداں ہیں تیرے اب تک

اور عشق خیز، رنگیں بستاں ہیں تیرے اب تک
داماں ہیں تیرے اب تک
اے سرزمینِ گجرات

عریاں ہے حُسن، تیرے سرسبز گلشنوں میں
آوارہ عشق، تیرے شاداب دامنوں میں
فطرت برہنہ، تیرے پُر نور ایمنوں میں
رنگین مسکنوں میں
اے سرزمینِ گجرات

اِک سوہنی ہے اب بھی، دامن میں تیرے پنہاں
اک یاسمیں ہے اب بھی، گلشن میں تیرے پنہاں
ہے اک شعاع اب بھی، ایمن میں تیرے پنہاں
مسکن میں تیرے پنہاں
اے سرزمینِ گجرات

بے کیفیِ جہاں کی تکلیف سے بچالے
للّٰہ مجھ کو اپنے صحراؤں میں بلالے
اور دوسرا مہینوال اپنا مجھے بنالے
دیوانوں کی دعا لے
اے سرزمینِ گجرات

آنکھوں میں بس رہی ہیں وہ پر بہار راتیں
وہ مشک بو ہوائیں، وہ مشکبار راتیں
وہ نشّہ گوں فضائیں، وہ نشّہ زار راتیں
وہ یادگار راتیں
اے سرزمینِ گجرات

ماضی کے آئینے سے، ہاں پھر نقاب اٹھا دے
بھولا ہوا سماں وہ دنیا کو پھر دکھا دے
گجرات کی فضا کو پھر نجد سا بنا دے
سلمیٰ سے پھر ملا دے
اے سرزمینِ گجرات

پھر آرزو کو رسوا کرنے کی آرزو ہے
رونے کی اور آہیں بھرنے کی آرزو ہے
سلمیٰ کے قدموں پر سر دھرنے کی آرزو ہے
مرنے کی آرزو ہے
اے سرزمینِ گجرات

ایک حُسن فروش سے

محبّت آہ تیری یہ محبت رات بھر کی ہے
تری رنگین خلوت کی لطافت رات بھر کی ہے
ترے شاداب ہونٹوں کی عنایت رات بھر کی ہے
ترے مستانہ بوسوں کی حلاوت رات بھر کی ہے
مہ روشن ہے تُو اور تیری طلعت رات بھر کی ہے
گُلِ شبّو ہے تو اور تیری نکہت رات بھر کی ہے
تو کیا جانے کہ سودائے محبت کس کو کہتے ہیں؟
محبت اور محبّت کی لطافت کس کو کہتے ہیں؟
غمِ ہجراں ہے کیا اور سوزِ الفت کس کو کہتے ہیں؟
جنوں ہونا ہے کیا اور وحشت کس کو کہتے ہیں؟
تو کیا جانے؟ غمِ شب ہائے فرقت کس کو کہتے ہیں؟
ترے اظہارِ الفت کی فصاحت رات بھر کی ہے
نگاہِ مست سے دل کو مرے تڑپا رہی ہے تُو
ادائے شوخ سے جذبات کو بھڑکا رہی ہے تُو

مجھے بچّے کی صورت نازسے پُھسلا رہی ہے تُو
کھلونے دے کے بوسوں کے مجھے بہلا رہی ہے تُو
مگر ناداں ہے تُو! آہ دھوکا کھا رہی ہے تُو
مجھے معلوم ہے تیری محبّت رات بھر کی ہے

ترا روئے درخشاں ہے بظاہر ماہتاب آسا
ترے ہونٹوں کی شادابی ہے رنگت میں شراب آسا
ترے رخسار کی مہتابیاں ہیں آفتاب آسا
مگر ان کی حقیقت ہے حباب آسا، سراب آسا
کہ غازے کی صباحت ان پہ چھائی ہے نقاب آسا
اور اس غازے کی بھی جھوٹی صباحت رات بھر کی ہے

یہ مانا تیری خلوت کی فضا، رشکِ گلستاں ہے
تری خلوت کا ہر فانوس اک مہتابِ لرزاں ہے
ترا ابریشمی بستر نہیں اک خوابِ خنداں ہے
ترا جسم آفتِ دل، تیرا سینہ آفتِ جاں ہے
تو اک زندہ ستارہ ہے جو تنہائی میں تاباں ہے
مگر کہتے ہیں تاروں کی حکومت رات بھر کی ہے

لطافت سے ہیں خالی ترے کھلائے ہوئے بوسے
طراوت سے ہیں خالی ترے مرجھائے ہوئے بوسے
نزاکت سے ہیں خالی ترے گھبرائے ہوئے بوسے
حقیقت سے ہیں خالی ترے شرمائے ہوئے بوسے
محبت سے ہیں خالی ترے گھبرائے ہوئے بوسے
اور ان بوسوں کی یہ جھوٹی حلاوت رات بھر کی ہے
ترے زہریلے بوسے مجھ کو جس دم یاد آئیں گے
مرے ہونٹوں پہ کالے ناگ بن کر تھرائیں گے
پشیمانی کے جذبے مجھ کو دیوانہ بنائیں گے
مرے افکار کو نفرت کے خنجر گدگدائیں گے
مرے دل کی رگوں میں غم کے شعلے تیر جائیں گے
میں سمجھا! آہ سمجھا! یہ مسرت رات بھر کی ہے
مجھے دیوانہ کرنے کی مسرت، بے خبر کب تک؟
رہے گی میرے دل میں تیری الفت کا اثر کب تک؟
مجھے مسحور رکھے گا یہ عشقِ بے ثمر کب تک؟
حقیقت کی سحر آخر نہ ہوگی پردہ در کب تک؟
مجھے مغلوب کرکے خوش ہے تو ظالم مگر کب تک؟
تری یہ فتح میری یہ ہزیمت رات بھر کی ہے

دل کی ویرانی

نوحہ زارِ عبرت ہے شہرِ دل کی ویرانی
روح کی پریشانی
ظلمتِ تغافل میں گم ہے شمعِ عرفانی
نورِ فکرِ انسانی

○

شوق ہے عمارت کا کائنات میں اب بھی
شش جہات میں اب بھی
خندہ زن ہیں انجم پر کاخہائے سلطانی
با ادائے سلطانی

○

بے چراغ، اب لیکن روح و دل کے ایواں ہیں
خستہ حال و ویراں ہیں
ظلمتوں میں خوابیدہ ہے دیارِ انسانی
جلوہ زارِ انسانی

اب بھی باغ و بستاں ہیں نوبہار سے معمور
سبزہ زار سے معمور
شاخسار پر رقصاں ہے شمیم بستانی
نکہتِ گلستانی

○

پر بدل گئی حالت بزمِ قلبِ انساں کی
نوبہارِ امکاں کی
بن گئی ہے مٹ مٹ کر یادگارِ ویرانی
داغ دارِ ویرانی

○

کوہسار ہیں اب بھی شاخسار سے آباد
برگ و بار سے آباد
دامنوں میں رقصاں ہیں آبشارِ نورانی
جوئبارِ نورانی

○

روح و دل میں ہیں لیکن سخت آفتیں برپا
ہاں قیامتیں برپا

ہو چکی ہے اب غارت، وہ فضائے روحانی
وہ صفائے روحانی

○

اب بھی ساغرِ خورشید، نور کا نشیمن ہے
جلوہ زارِ ایمن ہے
اب بھی ہے شعاعوں میں اس کی شعلہ سامانی
رنگ و نور و تابانی

○

رُوح و دل سے ہیں لیکن، کل حرارتیں رخصت
وہ لطافتیں رخصت
رہ گئے ہیں سینوں میں قطرہ ہائے بارانی
پرتوِ بیختانی

○

اب بھی ہوتی ہے زینت، ہر مکان و ایواں کی
مسکن و شبستاں کی
ذرّے ذرّے سے روشن ہے فروغِ نورانی
رونق و درخشانی

چھوڑ دی ہے انساں نے لیکن ایک مدت سے
اپنے جہل و غفلت سے
روح و دل کے ایواں کی نو بہار سامانی
افتخار سامانی

○

سازِ دہر سے جاری حرص کے ترانے ہیں
فسق کے فسانے ہیں
مٹ گیا ہے ہستی سے ذوقِ پاک دامانی
نقشِ کیفِ روحانی

○

ہو رہی ہے انساں میں خوئے شیطنت بیدار
اک بہیمیت ہے بیدار
منظروں پہ عریاں ہیں پھر قوائے شیطانی
جذبہ ہائے حیوانی

○

برہمن سے رخصت ہیں آج گیان کی باتیں
اور دھیان کی باتیں

شیخ میں نہیں باقی شیوۂ مسلمانی
پاسِ ذوقِ ایمانی

○

حرص و آز کی دُنیا بستی ہے خیالوں میں
پستی ہے خیالوں میں
بحرِ دل میں طوفانِ نَو ہے ہوس کی طغیانی
فسق کی فراوانی

○

دل نہیں ہیں سینوں میں عفّتوں کے رہزن ہیں
عصمتوں کے مدفن ہیں
رُوح جسم میں ہے یا پیکرِ ہوس رانی
موجِ خونِ نفسانی

○

چھا رہے ہیں غفلت کے پردے چشمِ انساں پر
کُل فضائے امکاں پر
چند روزہ ہے مہمانِ عہدِ عشرتِ فانی
دورۂ تن آسانی

نوحہ زارِ عبرت ہے شہرِ دل کی ویرانی
رُوح کی پریشانی
ظلمتِ تغافل میں، گم ہے شمعِ عرفانی
نورِ فکرِ انسانی

آہ وہ راتیں

جبینِ بندگی سے شوق کے سجدوں کی بارش ہے
اور اُن کی بھولنے والی نگاہوں سے گزارش ہے
کہ وہ گزری ہوئی مستانہ راتیں یاد ہیں اب بھی
وہ راتیں، وہ ملاقاتیں، وہ باتیں یاد ہیں اب بھی
وہ راتیں، آہ! جن کی گود میں ہم چھپ کے ملتے تھے
وہ باتیں جن کے پردوں میں دلوں کے تار ہلتے تھے
وہ راتیں، آہ! جو سیراب تھیں جوئے محبّت سے
وہ باتیں، آہ! جو شاداب تھیں بوئے محبّت سے
وہ راتیں، جب محبّت کے فسانے جاگ اُٹھتے تھے
ربابِ دل کے خوابیدہ ترانے جاگ اُٹھتے تھے

کتابِ عاشقی کے جب اُلٹتے تھے ورق ہم تم
وہ راتیں، جن میں بے خوابی کے لیتے تھے سبق ہم تم

سکوں سوتا تھا جب، بیتابیاں ہشیار ہوتی تھیں
وہ راتیں، جن میں دل کی دھڑکنیں بیدار ہوتی تھیں

سکون و صبر کھو دیتی تھیں جب تم، آہ وہ راتیں
خیالِ غم سے رو دیتی تھیں جب تم، آہ وہ راتیں

اگر تم کو یہ بھولی بسری باتیں یاد آجائیں
اور آغازِ محبت کی وہ راتیں یاد آجائیں

تو اُن راتوں کی رنگیں داستانی کی قسم تم کو
اور اپنی پاک دوشیزہ جوانی کی قسم تم کو

جو اُن راتوں میں روشن تھے قسم ہے اُن ستاروں کی
جو اُن راتوں میں بکھرے تھے قسم ہے اُن نظاروں کی

محبت کی اُنہی معصوم راتوں کی قسم تم کو
حقیقت کی اُنہی "موہوم" راتوں کی قسم تم کو

قسم اُس پاک بازی کی، جو تھی باہم خیالوں میں
قسم اُس بے نیازی کی جو تھی باہم سوالوں میں

اُنہی بہکی ہوئی نیچی نگاہوں کی قسم تم کو
اُنہی کھوئی ہوئی خاموش آہوں کی قسم تم کو
قسم اُس چاک دامانی کی جو مجبورِ وحشت تھی
قسم اُس پاک دامانی کی جو مغرورِ عفّت تھی
قسم اُن آنسوؤں کی جو بہائے تھے کبھی تم نے
وہ ستارے جو آنکھوں سے گرائے تھے کبھی تم نے
شروعِ عشق کی بےتابیوں کی ہے قسم تم کو
شبانِ ہجر کی بےخوابیوں کی ہے قسم تم کو
فقط اتنا بتا دو! کیا وہ باتیں پھر نہ آئیں گی ؟
وہ راتیں! آہ وہ راتیں! وہ راتیں! پھر نہ آئیں گی ؟

اعتراف

کسی سے کبھی دل لگایا نہ تھا
محبت کا صدمہ اٹھایا نہ تھا
حسینوں کے رونے پہ ہنستے تھے ہم
کبھی ایک آنسو بہایا نہ تھا
کوئی حُور ہو یا پری، اپنا سر
کسی آستاں پر جھکایا نہ تھا
دُکھاتے رہے نازنینوں کے دل
کسی نے دل اپنا دُکھایا نہ تھا
وہ دل تھا ہمارا کہ جس میں کبھی
فرشتوں نے بھی بار پایا نہ تھا

سیہ گیسوؤں کو تمنا رہی — مگر دل کو ہم نے پھنسایا نہ تھا
کوئی کیسا ہی ماہرو ہو مگر — ہماری نظر میں سمایا نہ تھا
زمانے میں وہ کون تھا زہرہ وش — کہ سینے سے جس نے لگایا نہ تھا
کوئی ہم سے کتنا ہی روٹھا مگر — کبھی بھول کر بھی منایا نہ تھا
حسینوں کے دل ہم نے چھینے سدا — مگر خود کبھی دل لگایا نہ تھا
کوئی نازنیں ہو کہ نازک بدن — کسی کا کبھی ناز اٹھایا نہ تھا
ہمیشہ سُنے دوسروں کے گِلے — کسی کا گِلہ لب پہ آیا نہ تھا
بسر کی سدا عیش و عشرت میں عمر — کبھی رنج ہم نے اٹھایا نہ تھا
مئے عیش سے مست و بیخود رہے — مزہ تلخیِ غم کا پایا نہ تھا
مگر اک جھلک نے ہمیں کھو دیا — یہ صدمہ تو ہم نے اٹھایا نہ تھا
کیا عشق کے درد میں مبتلا — فلک نے تو اتنا ہنسایا نہ تھا

"کہ جس کے عوض یوں رُلانے لگا"

ایک آرزو

سارے سنسار پہ گھنگور گھٹا چھائی ہے — جس طرف دیکھیے اک تازہ بہار آئی ہے
اس قدر مست ہوا ہے کہ فلک سے گویا — باغِ فردوس کی خوشبوئیں چرا لائی ہے
فطرتِ کہنہ گل افشاں ہے قبائے نو میں — عالمِ پیر کو پھر دعوتِ برنائی ہے

دل مچلتا ہی فضاؤں سے لپٹنے کے لیے
موجزن آج کچھ اس طرح کی رعنائی ہے

مینہ برستا ہے کہ ساون کی پری جنت سے
آبِ کوثر کی کوئی نہر بہا لائی ہے

بیخودی کہتی ہے ہر ذرّے کے بوسے لیجے
کیسی ہر ذرّے پہ رنگینی ہے زیبائی ہے

خوشنما پھولوں سے لبریز ہے گلشن کہ ہوا
اپنے دامن میں کوئی خلد اٹھا لائی ہے

یہ تو سب کچھ ہے مگر اب بھی کسر ہے باقی
دل کسی اور کسی کا بھی تمنّائی ہے

گُلِ نظارہ سے تکمیل کی بُو آ جائے
اگر ایسے میں کسی سمت سے تُو آ جائے

نوائے گُل

دیارِ دوست سے کوئی پیام لے کر آئی ہے ہوائے گُل
کہ گود میں مچل رہے ہیں بے طرح حسین خندہ ہائے گُل

بہار ہے خدائے گُل، تو بوئے گُل کو جا نیے دعائے گُل
چمن میں آکے بربطِ نسیم پہ سنے کوئی نوائے گُل

زمین و آسماں کا رازِ عشق کھل گیا جو شوخ چاند نے
کرن کے تار تار میں پرو لیے چرا کے بوسہ ہائے گُل

چمن میں روتے روتے بلبل آخر اک گہری نیند سو گئی
دبی زباں سے مرتے مرتے اتنا کہنے پائی تھی کہ ہائے گُل

نسیمِ صبح کی رقابتیں "حباب کی زباں" سے کہہ نہ دیں
یہ نہر لے تو جا رہی ہے، بھر کے دامنوں میں بوسہ ہائے گل

لرز رہا ہے میرا دل کہیں خزاں کی آندھیاں گرا نہ دیں
کہ جھولتی ہے تین چار پتّیوں پہ کارواں سرائے گل

کہیں نہ کوچ کر رہا ہو گلستاں سے قافلہ بہار کا
یہ آج منہ اندھیرے ہی سے جاگ اٹھا ہے ورنہ کیوں درائے گل

مرے دل و دماغ و گوش و چشم و تن پہ کیف بن کے چھا گئی
ادائے گل، ہوائے گل، نوائے گل، فضائے گل، قبائے گل

حریم رنگ و بو میں آج ملکۂ بہار جلوہ ریز ہے
نسیمِ صبح نے اٹھا دیئے ہیں ہر طرف سے پردہ ہائے گل

یہ آرزو ہے اختراب کہ مر کے اس کے رنگ و بو میں سو رہوں
مرا مزار ہو سرائے گل، مرا کفن بنے قبائے گل

چند لمحے عذرا کے ساتھ

کوئی مہ جبیں جلوہ دکھلا گئی
مرے گھر پہ شامِ بہار آ گئی

تصوّر کی رنگینیاں کیا کہوں
جدھر دیکھیے پھول برسا گئی

مہکتا ہے اب تک شبستاں مرا
فضا میں بہاریں سی پھیلا گئی

نگاہوں میں موتی بکھرنے لگے
خیالوں میں تارے سے برسا گئی

تخیل میں بجلی نے انگڑائی لی
تصوّر میں ناہید لہرا گئی

فضاؤں کو جلوؤں سے روشن کیا
ہواؤں کو خوشبو سے مہکا گئی

سیہ پیرہن پر ستاروں کا رنگ
کہ تاروں بھری رات شرما گئی

تصوّر میں اب تک مچلتے ہیں طُور
یہ کس کی تجلّی نظر آ گئی

ہوا، بوئے رنگیں سے بیخود ہوئی
گھٹا، زلفِ مشکیں سے شرما گئی

اداؤں سے فتنے برستے رہے
نگاہوں سے میخانے چھلکا گئی

بڑھی جیسے صبحِ بنارس بڑھے
اٹھی، جیسے شامِ اودھ چھا گئی

وہ آنکھیں کہ رقصاں شبِ میکدہ
وہ نظریں کہ بجلی سی لہرا گئی

شبستاں میں آئی کچھ اس ناز سے
کہ جیسے چمن میں بہار آ گئی

وہ ابریشمیں بال، کرنوں کے ہار
وہ چوٹی کہ ناگن سی بل کھا گئی

بدن، جیسے کلیوں کا معصوم خواب
کمر، یا کوئی شاخ لہرا گئی

گھٹاؤں نے دیکھیں وہ بجلیاں
جو نیچی نگاہوں سے دکھلا گئی

وہ شیریں تکلّم، وہ رنگیں صدا
بہشتوں کی موسیقی شرما گئی

سنائی غزل اس نے اس ناز سے
کہ خود شعر کی دیوی لہرا گئی

سماعت کو بلبل کا دھوکا ہوا
کہ ناہید بربط بکف آ گئی

اُٹھیں آنکھیں، بادل سے لہرا گئے
ملیں نظریں، بجلی سی تھرّا گئی

محبت، جسے بھول بیٹھا تھا میں — اُسے دیکھ کر پھر سے یاد آگئی
تمنا کی بے تابیاں بخش کر — جوانی کی راتوں کو تڑپا گئی
محبت، خوشی، زندگی، سب کے راز — مجھے آنکھوں آنکھوں میں سمجھا گئی
نہ سمجھا خضر زندگی کا جو بھید — وہ باتوں ہی باتوں میں بتلا گئی
مہک بن کے دم بھر کو ٹھہری مگر — مری زندگی بھر کو مہکا گئی
مری حسرتِ بوسہ کو، ناز سے — "بری بات ہے" کہہ کے بہلا گئی

یہ افسانہ ہے مختصر اس طرح
کہ اختر کے پہلو سے عذرا گئی

اُن سے

دلِ غم دیدہ کو غم سہنے کی عادت نہ رہی — چشمِ محزوں میں بھی رونے کی ہمت نہ رہی
مرنے کے دن نہیں اور جینے کی حسرت نہ رہی — رحم کر رحم کہ اب ضبط کی طاقت نہ رہی

دردِ دل بڑھ کے نہ محتاجِ مداوا ہو جائے
تیرے قربان ترا عشق نہ رسوا ہو جائے

کیا غضب ہے کہ غمِ ہجر سنا بھی نہ سکیں — سینے کا زخم دکھائیں تو دکھا بھی نہ سکیں
صبر ہو بھی نہ سکے رنج اٹھا بھی نہ سکیں — آپ جا بھی نہ سکیں تجھ کو بلا بھی نہ سکیں

غمِ دل کون سنے تیری بلا بھی نہ سنے
اور نصیبوں کو یہ ضد ہے کہ خدا بھی نہ سنے

عشق نے ظلم وہ ڈھائے ہیں کہ جی جانتا ہے ‏ یاس نے گل وہ کھلائے ہیں کہ جی جانتا ہے
درد، دکھ، دل نے وہ پائے ہیں کہ جی جانتا ہے ‏ ہم نے وہ رنج اٹھائے ہیں کہ جی جانتا ہے

اشک پروردہ ہیں غم دیدہ ہیں مہجور ہیں ہم
او! پری پاس بلا لے کہ بہت دور ہیں ہم

جانتا ہوں کہ تمہیں بھی ہے محبت مجھ سے ‏ گر یہ سچ ہے تو سنو ایک شکایت مجھ سے
پہلے تو رکھتی تھیں تم خط و کتابت مجھ سے ‏ کہتی سنتی تھیں بہم قصۂ الفت مجھ سے

پھول کی طرح مہکتے ہوئے خط آتے تھے
دیکھ کر جن کو کنول روح کے کھل جاتے تھے

اب مگر مدّتیں گزریں کہ وہ حالت نہ رہی ‏ وہ نوازش وہ مروّت وہ عنایت نہ رہی
یہ تو کس دل سے کہوں مجھ سے محبت نہ رہی ‏ ہاں مگر اور خیالات سے فرصت نہ رہی

تم ہو اب اور مدارات ہے بیگانوں کی
کون لیتا ہے خبر عشق کے دیوانوں کی

خط تو لکھنے کو ہمیں لکھتی ہو اب بھی اکثر ‏ اجنبیت سے بھرے ہوتے ہیں لیکن یکسر
نام کو بھی نہیں ہوتا ہے محبت کا اثر ‏ آخر اس طرزِ تخاطب سے ہے کیا مدِّ نظر

کیا یہ مطلب ہے کہ میں لائقِ الفت نہ رہا
دل مرا درخورِ غم ہائے محبت نہ رہا

دردمندوں پہ یہ ظلم اور ستم ایجاد نہ کر
میری امیدوں کی فردوس کو برباد نہ کر
اس پہ راضی ہوں کہ تا حشر مجھے یاد نہ کر
بن کے انجان، مگر مائلِ فریاد نہ کر

حال یہ ہے کہ دل اب غم سے مٹا چاہتا ہے
عشقِ پردہ نشیں بے پردہ ہوا چاہتا ہے

پھر نہ کہنا کہ "عبث کر دیا بدنام ہمیں
پہلے معلوم نہ تھا پیار کا انجام ہمیں"
یا یہ حیلہ کہ "نہیں آپ سے کچھ کام ہمیں
آپ بھیجا نہ کریں عشق کے پیغام ہمیں"

دیکھ لینا یہ بہانے نہیں کام آئیں گے
تیرے دیوانے ترے عشق میں مر جائیں گے

میرے انجام پہ پچھتاؤ گی تم، یاد رہے
اپنے اس ظلم سے شرماؤ گی تم، یاد رہے
اب اگر رحم نہ فرماؤ گی تم، یاد رہے
حشر تک پھر نہ ہمیں پاؤ گی تم، یاد رہے

"رفتم از دستِ تو اے غارتِ ایماں رفتم
بہ ہوا ئیم نہ شتابی کہ شتاباں رفتم"

سرزمینِ عشق

اک سرزمینِ عشق ہے!
ہنگامۂ عالم سے دور، آفت گہِ ہستی سے دور
اس مکر کی دنیا سے دور، اس ظلم کی بستی سے دور

اس رات، اس دن سے الگ، اس اوج اس پستی سے دُور
دُور از زمین و آسماں
اک سرزمین عشق ہے!

اس کے گلستاں پُر فضا، اس کی بہاریں دل نشیں
اس کی زمینیں خوشنما، اس کی فضائیں مرمریں
اس کے نظارے دل کشا، اس کی ہوائیں عنبریں
مثلِ بہشتِ گل فشاں
اک سرزمینِ عشق ہے!

ہاں یہ بہشتی سرزمیں اک سازِ وجد انگیز ہے
جس کے سنہری پردوں میں ہر نغمہ خواب آمیز ہے
اور "دیوتائے عشق" کی پرواز سے لبریز ہے
ہم رنگِ خوابِ ایزداں
اک سرزمینِ عشق ہے!

اک وادیٔ اسرار ہے، اک جلوہ گاہِ ناز ہے
جس کی فضا میں موجزن اک سرمدی آواز ہے
اور جس کا ہر نغمہ گدازِ روح کی پرواز ہے
ہمنائے بوئے گلستاں
اک سرزمینِ عشق ہے!

گزری ہوئی راتیں

نہ بھولے گا تری راتوں کو شرماتے ہوئے آنا
رسیلی انکھڑیوں سے نیند برساتے ہوئے آنا

رخِ روشن کے جلوؤں سے سحر کا نور بن بن کر
اندھیری رات کے پردوں کو سرکاتے ہوئے آنا

روپہلی چاندنی میں اپنی مستانہ خرامی سے
بہارِ خواب کے سائے سے برساتے ہوئے آنا

محبت کے فرشتے کی طرح خاموش راتوں میں
فضا کو نکہتِ گیسو سے مہکاتے ہوئے آنا

ترے پازیب کی جھنکار کا آہستہ آہستہ
وہ دھیمی دھیمی لے میں گیت برساتے ہوئے آنا

ترے ابریشمی ملبوس کا صرصر کے جھونکوں سے
سحابِ رنگ و بو کی طرح لہراتے ہوئے آنا

بدن اپنا چرا لینا، کبھی نظریں جھکا لینا
ہم آغوشی کے اندیشے سے گھبراتے ہوئے آنا

شبِ تاریک کے خاموش نظّاروں کی بستی کو
شرابِ نور کی موجوں سے نہلاتے ہوئے آنا

نگاہوں میں حیا، آنکھوں میں مستی، چال میں لغزش
مصوّر کے قلم کے خواب برساتے ہوئے آنا

ہواؤں کا مہک اٹھنا، فضاؤں کا بہک اٹھنا
وہ مہکاتے ہوئے آنا، وہ بہکاتے ہوئے آنا

محل کے پاسباں خوابیدہ، شمعیں خواب در دیدہ
اور اے ملکہ ترے سائے کا شرماتے ہوئے آنا

پشیمانِ آرزو

علاجِ دردِ دلِ بے قرار کر لیتے
تلافیِ غمِ لیل و نہار کر لیتے
ستم شعار کو جی بھر کے پیار کر لیتے

فسانۂ غمِ فرقت اُنھیں سناتے ہم
جو ہم پہ گزری ہے حالت انھیں دکھاتے ہم
اور اپنے ساتھ انھیں اشکبار کر لیتے

یہ کہتے: چاکِ گریباں کو دیکھیے تو سہی
ہمارے حالِ پریشاں کو دیکھیے تو سہی
اور اس بہانے انھیں ہم کنار کر لیتے

جفائے چرخِ ستم گار نے نہ دی مہلت
ہمارے بختِ جفا کار نے نہ دی مہلت
کہ ان کے قدموں پہ ہم جاں نثار کر لیتے

امیدِ وصل کبھی کامیاب ہو نہ سکی
دعائے نیم شبی مستجاب ہو نہ سکی
کہ دردِ دل سے انھیں بے قرار کر لیتے

الٰہی! موت کے کیا کیا مزے نہ لیتے ہم
کسی کے زانو پہ سر رکھ کے جان دیتے ہم
اور اپنے غم میں انھیں سوگوار کر لیتے

گر اُن کے وعدے کا کچھ بھی ہمیں یقیں ہوتا
تو دل میں درد، زباں پہ گلہ نہیں ہوتا
غمِ فراق کبھی خوشگوار کر لیتے

دلِ حزیں کو ہمیشہ یہ آرزو ہی رہی
نگاہِ شوق کو ہر دم یہ جستجو ہی رہی
پرستشِ رُخِ رنگیں نگار کر لیتے

گر ابتدائے محبت میں موت آ جاتی
سکونِ خوابِ عدم کا مزہ چکھا جاتی
تو زندگی کو نہ یوں ناگوار کر لیتے

ستم ہے اس بتِ زہرہ جبیں کو کھو بیٹھے
اور اپنی زیست سے ہم نا امید ہو بیٹھے
اسی پہ کاش ہم اس کو نثار کر لیتے

"نشے" میں قطبِ شمالی کے پار اُتر جاتے
طلسمِ ماہ و ثریا سے بھی گزر جاتے
گر ایک بار کبھی ہم اُن کو پیار کر لیتے

حبابِ عالمِ فانی کو چھوڑ دیتے ہم
حصارِ چرخِ بریں کو بھی توڑ دیتے ہم
اگر کبھی ہم انھیں ہمکنار کر لیتے
خدائی بھر میں کسی شے کی جستجو ہی نہ تھی
سوائے اس کے کچھ اخترؔ کی آرزو ہی نہ تھی
ستم شعار کو جی بھر کے پیار کر لیتے

ایک تصویر دیکھ کر

یہ حسنِ نازنیں، یہ جلوۂ ناز آفریں تیرا
یہ معصومانہ چہرہ غنچۂ شاداب کا عالم
یہ مستانہ نگاہیں، اک بہشتی خواب کا عالم
سراپائے خیالِ حور جسمِ نازنیں تیرا
مجسّم خندۂ خوابِ پری، روئے حسیں تیرا
یہ موتی، یہ جبیں، یا انجم و مہتاب کا عالم
پریشاں خواب کا سا گیسوئے شب تاب کا عالم
چمن زارِ شعاعِ نور، عکسِ دل نشیں تیرا

تو از سر تا بپا اک نکہت و تنویر ہے سلمیٰ
شراب و شعر و موسیقی میں پنہاں تیری نکہت ہے
مرے خاموش دل میں موجزن تیری محبت ہے
بہار اور خواب کا ہیکل، تری تصویر ہے سلمیٰ
ادا اس طرح فرضِ رونمائی کچھ تو کر جاؤں!
تری تصویر سینے سے لگا لوں اور مر جاؤں!

......کا نغمہ سن کر

نظر کے سامنے رقصاں ہیں رنگیں وادیاں گویا
شراب و شعر میں ڈوبی ہوئی ساری فضائیں ہیں
افق پر موجزن مستانہ خوابوں کی ہوائیں ہیں
فضا میں بس رہی ہیں نور کی آبادیاں گویا
خلا میں پرفشاں ہیں حسن کی شہزادیاں گویا
بہار و کیف سے لبریز فردوسی ہوائیں ہیں
اور ان میں منتشر غمگین روحوں کی صدائیں ہیں
مہیا ہیں سکون و ہوش کی بربادیاں گویا

وہ دنیا ہے جہاں جنت کے نظارے برستے ہیں
شفق کی سطح پر آباد خوابوں کے جزیرے ہیں
ستاروں کے سمندر، ماہتابوں کے جزیرے ہیں
بہاریں منظروں میں پھول اور تارے برستے ہیں
فضا ہے مست، موجِ نکہتِ بادِ بہاری سے
اور اس پر تیرتا پھرتا ہوں میں بے اختیاری سے

دنیا کی بہاریں

یہ دنیا، یہ نظارے اور یہ رنگین فضائیں ہیں
یہ جلوے چاند سورج کے، یہ تابانی ستاروں کی
یہ نزہت لالہ زاروں کی یہ فعت کوہساروں کی
یہ بھینی بھینی، آوارہ سی خوشبوئیں ہوائیں ہیں
یہ بکھری بکھری مستی جھومنے والی گھٹائیں ہیں
یہ تیزی آبشاروں کی، روانی جوئباروں کی
یہ پھولوں کا ہجوم اور یہ لطافت سبزہ زاروں کی
یہ موسیقی جو رقصاں ہے پرندوں کی صدائیں ہیں

یہ نغمے، یہ ترانے، یہ شراب و شعر کا عالم
یہ آرائش مکانوں کی، یہ زیبائش مکینوں کی
یہ رعنائی حسینوں کی، یہ صحبت نازنینوں کی
یہ عمریں، یہ بہاریں، یہ شباب و شعر کا عالم
نہ لے جا خلد میں یارب! یہیں رہنے دے تو مجھ کو
یہ دنیا ہے تو جنت کی نہیں ہے آرزو مجھ کو

کلوپیٹرا

وادیٔ نیل پہ طاری تھا بہاروں کا سماں
جلوۂ سبزہ و گل سے تھیں فضائیں شاداب
نشۂ بادِ بہاری سے ہوائیں شاداب
محوِ پرواز تھا رنگین ستاروں کا سماں
مائلِ رقص ہو جس طرح شراروں کا سماں
نورِ انجم سے تھیں منظر کی ادائیں شاداب
نکہت و رنگ کی آوارہ گھٹائیں شاداب
چار سو، پال فشاں میکدہ زاروں کا سماں

یک بیک اک شفق اندام ستارہ ٹوٹا!
بن کے اک غنچۂ زرکار گرا وادی میں!
اور اک خواب نما پھول کھلا وادی میں!
دیکھتے دیکھتے نیرنگِ نظارہ ٹوٹا!
جلوۂ فطرتِ رنگیں کی تھی تنویر اُس میں
ایک عورت کی پریشان تھی تصویر اُس میں

عورت

فنونِ لطیفہ کی دنیا میں

کہیں وہ شعر کے پردے میں چھپ کر مسکراتی ہے
مصوّر کی نظر میں اس کی تصویریں پریشاں ہیں
ادب کی محفلوں میں اس کی تنویریں پریشاں ہیں
مغنّی کی صدا میں نغمہ بن کر جھلملاتی ہے
نقابِ ساز میں آہنگ ہو کر تھرتھراتی ہے
نقوشِ آب و گل میں اس کی تصویریں پریشاں ہیں
صنم سازوں کے دل میں اس کی تفسیریں پریشاں ہیں
حریمِ رنگ و بو میں نشّہ بن کر لہلہاتی ہے

ہراک تصویر کے رنگوں میں نکہت اس کی آوارہ
حسین اور خوشنما اشعار، شاداب اُس کے نغموں سے
ہمارے بربطوں کے تار بے خواب اس کے نغموں سے
بتوں کے مرمریں پردوں میں نکہت اس کی آوارہ
غرض جب تک یہ دنیا اور اس کی خوشنمائی ہے
ہماری زندگانی بھر یہ عورت کی خدائی ہے

لالۂ صحرا

بہارِ صبحِ عریانی ہے، جسمِ یاسمیں اس کا
لباسِ سادہ ہے تزئین کی صورت سے بیگانہ
یہ صحرائی حسینہ ہے ہراک زینت سے بیگانہ
نہیں ممنون غازہ کا، جمالِ دل نشیں اس کا
معرّا ہے ہر آرائش سے حُسنِ نازنیں اس کا
تکلّف سے بری اور نازکی عادت سے بیگانہ
ہراک رنگینِ نظر، غمزے کی کیفیت سے بیگانہ
مگر ہے عشق سے لبریز، قلب آتشیں اس کا

محبت، جب کسی کے جذبِ دل کو گدگداتی ہے
نہیں کرتی ہے فرقِ شہر و صحرا ماہتاب آسا
چلی آتی ہے ہر دوشیزہ کے دل میں حجاب آسا
اور آ کر ساز کے تاروں کی تہہ میں مسکراتی ہے
فضا میں موجزن، نغمات کا نظارہ ہوتا ہے
اور اک اک نغمۂ سوزِ عشق کا گہوارہ ہوتا ہے

ساقی اُٹھ تلوار اُٹھا

(یونان کے ایک رند مگر محبِ وطن شاعر کے نقطۂ نظر سے)

پھر امن کی رنگیں وادی سے ہنگامۂ گیر و دار اُٹھا
دنیائے سکوں کے پہلو میں پھر فتنۂ حشر آثار اُٹھا
ہستی کے بہاریں مطلع پر پھر ابرِ شرارہ بار اُٹھا
بے کار ہیں چنگ و تار اُٹھا
اُٹھ ساقی اُٹھ تلوار اُٹھا

پھر کارگہِ انسانی پر خونخواری و وحشت پھیلی ہے
افضائے زمیں فتنوں سے پُر اور فتنوں کی ہیبت پھیلی ہے

یزداں کی حکومت مٹ سی گئی شیطاں کی حکومت پھیلی ہے

پھر غلغلۂ تاتار اٹھا
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

پھر طبل وغا کا شور ہوا، آفاق کے ایواں کانپ اٹھے
پھر باغ وگلستاں کانپ اٹھے پھر دشت وخیاباں کانپ اٹھے
صحرا و کہستاں کانپ اٹھے، دریا و بیاباں کانپ اٹھے

آوازۂ گیرو دار اٹھا
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

سربازوں کے جنگی نعروں سے پھر ساحل و میداں گونجتے ہیں
طیاروں کی آتشباری سے ہامون و کہستاں گونجتے ہیں
دریاؤں کی تہ میں توپوں کے بھیرے ہوئے طوفاں گونجتے ہیں

یا دیو شرارہ خوار اٹھا
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

سن وقت کی آواز آتی ہے وہ دورۂ غفلت ختم ہوا
ساغر کو الٹ، بربط کو اٹھا ہنگامۂ عشرت ختم ہوا
جانبازی کی ساعت آپہنچی، رویائے محبت ختم ہوا

ہیں جام و سبو بیکار اٹھا
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

پہلو سے ہٹا دے دستۂ گل ہنگامِ بہاراں رخصت ہے
نظروں میں ہے نقشہ میداں کا تزئینِ گلستاں رخصت ہے
پھر صبحِ قیامت آ پہنچی، پھر لطفِ شبستاں رخصت ہے

پھر مہرِ قیامت بار اُٹھا
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اُٹھا

دشمن ہے قریب اور خطرے میں ہے ماہ لقائے آزادی
دل میرا نثارِ آزادی، جاں میری فدائے آزادی
اُٹھ جلد کہ غاصب چھین نہ لیں ہاتھوں سے لوائے آزادی

وہ ہلہلۂ یلغار اُٹھا
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اُٹھا

غیرت کہ عدو کے نرغے میں ہے خاکِ وطن، بستانِ وطن
ناپاک قدم سے غیروں کے آلودہ نہ ہو میدانِ وطن
یہ عمرِ جواں گلکارِ وطن، یہ عشقِ حسیں قربانِ وطن

پھر ولولۂ پیکار اُٹھا
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اُٹھا

وہ دیکھ وطن کی سرحد پہ دشمن کے عساکر چھانے لگے
موجوں کی طرح بل کھانے لگے، طوفاں کی طرح لہرانے لگے

دامانِ افق سے طیّارے آگ اور دھواں برسانے لگے
یا ابر سیہ کہسار اُٹھا
اٹھ ساقی اُٹھ تلوار اُٹھا

ہم مست ہیں لیکن تیغ بکف میدان میں جانے والے ہیں
اعدائے وطن کے سینوں پہ بجلی سی گرانے والے ہیں
اور اُن کے وطن میں اُن کی جگہ فریادیں بسانے والے ہیں
یہ چنگ ہٹا، یہ تار اُٹھا
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اُٹھا

دشمن کا لہو پینا ہے ہمیں رہنے دے مئے گلفام نہ دے
تلوار اٹھانے والوں کے ہاتھوں میں چھلکتا جام نہ دے
صہبا کی جگہ رقصاں ہے لہو مستی کا فریب خام نہ دے
یہ جامِ مئے گلنار اُٹھا
اٹھ ساقی اُٹھ تلوار اُٹھا

ناموسِ وطن کو غیروں کے پنجے سے بچانے جاتے ہیں
مدت سے ہیں پیاسی تلواریں پیاس اُن کی بجھانے جاتے ہیں
دشمن کی تڑپتی لاشوں کا کھیل اُن کو دکھانے جاتے ہیں
لا برقِ فنا آثار اُٹھا
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اُٹھا

وہ دیکھ اُس اونچی چوٹی سے جو دور دکھائی دیتی ہے
لیلائے وطن کی درد بھری آواز سُنائی دیتی ہے
جو اُڑتے ہوئے پرچم کے تلے رو رو کے دہائی دیتی ہے
سُن ہشتر سرِ کہسار اُٹھا
اُٹھ ساقی اُٹھ تلوار اُٹھا

میں رک نہیں سکتا جاؤں گا اور دھوم مچاتا جاؤں گا
بربط کی طرح ان وادیوں میں تلوار بجاتا جاؤں گا
اس سازِ حسیں پر حبِّ وطن کے نغمے سناتا جاؤں گا
بربط کو ہٹا ہتھیار اُٹھا
اُٹھ ساقی اُٹھ تلوار اُٹھا

اُٹھ نام و شرف کی موت اچھی بے نام و شرف کے جینے سے
ہے خونِ عدو پینے میں سوا لذت مئے سادہ پینے سے
بھری ہوئی اک مستانہ صدا آتی ہے فضا کے سینے سے
پھر ہو کے سرِ سرشار اُٹھا
اُٹھ ساقی اُٹھ تلوار اُٹھا

پھر جشم ہمراہِ جرأت ہے لیلائے شہادت میداں میں
شاداب ہوا کرتی ہے سدا ہر قوم کی عظمت میداں میں

تلواروں کی خونیں بارش سے کھل جاتی ہے جنّت میداں میں
گلہائے طرب کا ہار اُٹھا
اُٹھ ساقی اٹھ تلوار اُٹھا

بجلی کی طرح رگ رگ میں رواں پھر عشقِ تپانِ ملّت ہے
شیرانہ سوئے جنگاہ دواں ایک ایک جوانِ ملّت ہے
اور قومی نشاں میں بال فشاں پھر شوکت شانِ ملّت ہے
وہ رایتِ عظمت بار اُٹھا
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اُٹھا

خاموش کر اپنے بربط کو خوابوں کا اثر ہر تار میں ہے
وہ لطف کہاں ہے اس میں جو تلوار کی اک جھنکار میں ہے
ہنگامۂ قتل و غارت کا ارمان دلِ سرشار میں ہے
یہ بربطِ راحت بار اُٹھا
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اُٹھا

ہشیار کہ ہو جائے نہ کہیں پامالِ خزاں، گلزارِ وطن
گلہائے ارم سے بڑھ کے ہمیں محبوب ہے، اک اک خارِ وطن
گہوارۂ ماہ و انجم ہے رفعت کدۂ کہسارِ وطن
پھر دل میں سرِ پندار اُٹھا
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اُٹھا

مانا کہ کوئی ذرّہ بھی یہاں، آزادِ غمِ ایّام نہیں
قابو میں کسی کے صبح نہیں، قبضے میں کسی کے شام نہیں
پر عشقِ وطن کے ماروں کا مرنے کے سوا کچھ کام نہیں
آنکھیں ہوئیں کیوں خونبار اُٹھا
اُٹھ ساقی اُٹھ تلوار اُٹھا

جشنِ بہار

جب وادیِ گل کے شعرستاں پر خاموشی چھا جاتی ہے
جب لیلیٰ شب کی زلفِ سیہ، سینے تک لہرا جاتی ہے
جب موجِ ہوائے ساحل کو، نشّوں بھری نیند آجاتی ہے
جب چاندنی دشت و گلشن میں موتی سے برسا جاتی ہے
جب زمزمہ زارِ ہستی اک ہو کی بستی ہو جاتا ہے
جب نیند کی گہری مستیوں میں سارا عالم کھو جاتا ہے
جب وادی کی کم سن کلیوں تک زہرہ کی شعاعیں آتی ہیں
اور اُن کے رنگ و بو کے رسیلے پردوں میں بس جاتی ہیں
پھر شبنم بوسے لیتی ہے مستی کی بہاریں چھاتی ہیں
اور ماہوشانِ کاہکشاں، گل ہائے طلا برساتی ہیں

جس وقت یہ سب رنگینیاں اس وادی میں یکجا ہوتی ہیں
تب کلیوں کے رنگیں پہلو سے کچھ حوریں پیدا ہوتی ہیں

پھر حوریں یہ ساری مل جل کر اک نغمۂ رنگیں گاتی ہیں
اور دائرے کی سی صورت میں سب رقص اپنا دکھلاتی ہیں
ایک ایک حریری جنبش سے جنت کے سمے برساتی ہیں
اور وادیِ ماہ و انجم کے نظّاروں کو شرماتی ہیں

سنسان فضا میں نغموں کا اک طوفان بپا ہو جاتا ہے
ویران ہوا میں رقص کا اک ہیجان بپا ہو جاتا ہے

یوں رات بھر ان کے مست ترانے جھومتے ہیں گلزاروں پر
اور رات بھر ان کا رقصِ بہاریں تیرتا ہے کہساروں پر
شاداب و حسیں رعنائیاں سی چھائی رہتی ہیں تاروں پر
اک حشر سا نور و نکہت کا رہتا ہے بپا نظّاروں پر

جب صبح کو سورج کی کرنیں مشرق سے ابھر کر آتی ہیں
تب شرم کی ماری یہ کلیوں کے پردوں میں چھپ جاتی ہیں

نوائے عجیب

مجھے تاروں کی آبادی سے اک آواز آتی ہے
کوئی کرنوں کے بربط پر سنہری گیت گاتا ہے
اور اپنے گیت سے خوابیدہ دنیا کو جگاتا ہے
فضاؤں میں بہارِ کیف و نکہت مسکراتی ہے
خدائی سلسبیلِ بیخودی میں ڈوب جاتی ہے
یہ نغمہ روح کے پردوں کو جا کر گدگداتا ہے
اور اپنی مست نے میں یہ سندیسہ لے کر آتا ہے
کہ فطرت اپنے شعرستان میں مجھ کو بلاتی ہے

یہ کون آباد ہے ان روشن و رنگیں ستاروں میں ؟
ہے کس کا نورِ عریاں کہکشاں کی شاہراہوں پر ؟
ہیں کس کے نغمے رقصاں ان طلائی جلوہ گاہوں پر ؟
یہ کس کی لے چھپی ہے بربطِ انجم کے تاروں میں ؟
یہ کس کے جلوے مضطر ہیں قمر کے آبگینے میں ؟
یہ کون آ کر سمایا جا رہا ہے میرے سینے میں ؟

گل بانگِ قفس

مدت سے نہ آئی کوئی خبر، یارانِ گلستاں کیسے ہیں؟
اے بادِ صبا، اتنا تو بتا، سرو و گل و ریحاں کیسے ہیں؟

پابندِ قفس تو کیسے کہیں اور کس سے کہیں رودادِ قفس
آزادِ قفس بتلائیں ہمیں، اربابِ گلستاں کیسے ہیں؟

ہر ایک قدم یاں محبسِ غم، ہر تازہ ستم اک مصرِ الم
اس حال میں پوچھیں کس سے یہ ہم، غم دیدۂ کنعاں کیسے ہیں؟

ہمدرد ہے اپنا کون یہاں، لا تو ہی خبر اے بادِ خزاں
اس سال وطن کے باغوں میں گلہائے بہاراں کیسے ہیں؟

غربت ہی نہ تھی کم ہوش رُبا، اس پر یہ اسیری رنج فزا
ہے کون جو پوچھے آکے ذرا، ہم خستہ حرماں کیسے ہیں؟

صیاد نے کیوں چُن چُن کے کیا، بے جرم و خطا محبوسِ بلا
ہے کس کو غرض جو پوچھے ذرا، آباد یہ زنداں کیسے ہیں؟

اے موجِ نسیمِ صبحِ چمن، خوش باش سُنا پھر حالِ وطن
کہسار و دمن کس حال میں ہیں وادی خیاباں کیسے ہیں؟

کیا پوچھتی ہے اے شامِ قفس، افسانۂ رنگ و بوئے چمن
ہم قیدیوں کو کیا علم کہ اب گُل کیسے؟ گلستاں کیسے ہیں؟
گُل بانگِ قفس ہی بن جائے، اے کاش نوائے آزادی
کیا کہیئے کہ اختؔر سینے میں مچلے ہوئے ارماں کیسے ہیں؟

ایک دوست کی خودکشی پر

آرزو تھی، ہم بھی دیکھیں تماشائے فنا
تھی مقدّر، لیکن اس کی ابتدا تیرے لیے
کتنی آساں ہو گئی راہِ فنا تیرے لیے
کھنچ گیا آنکھوں میں نقشِ حُسنِ لیلائے فنا
پی گیا تو بے تامّل، جامِ صہبائے فنا
خواب تھا، اک خواب، یارض و سما تیرے لیے
ایک دھوکا تھا سکوں زارِ بقا تیرے لیے
جنبشِ خنجر میں پوشیدہ تھی دنیائے فنا

غالب و خیام کے شعروں کا تو دیوانہ تھا
جن کے ایوانوں میں کیفِ رواں ہے زندگی
طائرانِ رنگ و بو کا کارواں ہے زندگی

اُن کی طفلانہ بقا سے تو مگر بیگانہ تھا

حسن تھا مطلوب اُن کو عمر فانی کے لیے

اور تیری موت، حسن جاودانی کے لیے

میرا مشغلہ

زبانِ خامہ سے پھر گل کھلانے کی تمنّا ہے

کہ اک گل رُخ نے پوچھا ہے "تمہارا شغل اب کیا ہے؟"

پریشاں حالیاں اس پرسشِ احوال کے قرباں

مرا ہر شعر اس کی زُلف کے ہر بال کے قرباں

مری چشمِ حزیں اس دلرُبا تحریر کے صدقے

دلِ دیوانہ، اس مشکیں ادا زنجیر کے صدقے

حسیں الفاظ میں جذبوں کا اک طوفاں نہاں ہے

اثر سے جس کے دل میں بجلیوں کا جوشِ رقصاں ہے

جبینِ بندگی آمادہ ہے سجدے لٹانے کو

زبانِ شوق مضطر ہے سرودِ عشق گانے کو

دلِ مضطر کو ارماں ہے مچل کر خامہ بن جائے

تمنّا کو یہ حسرت ہے اُبل کر نامہ بن جائے

جنوں کہتا ہے پندارِ جنوں کی انتہا کر دوں
مہ و انجم کو اُس کے پائے نازک پر فدا کر دوں

جوانی مضطرب ہے شوق کا اظہار کر آؤں
اور اُس بلقیس وش کے گیسوؤں کو پیار کر آؤں

محبّت مسکراتی ہے کہ ان کا سامنا ہو گا
تو دل ہی کو نہیں، دونوں جہاں کو سامنا ہو گا

جنونِ بے خودی بس کر کہ عرضِ داستاں کر لوں
حضورِ حسن میں کچھ مشغلہ اپنا بیاں کر لوں

ادب سے جا کے کہنا اے صبا اس شوخ پُرفن سے
کہ رومان اور محبّت مشغلہ ہے میرا بچپن سے

محبّت کے لیے آیا ہوں میں دنیا کی محفل میں
محبّت خون بن کر لہلہاتی ہے مرے دل میں

ہر اک شاعر، مقدّر اپنا اپنے ساتھ لایا ہے
محبّت کا جنوں تنہا مرے حصّے میں آیا ہے

محبّت ابتدا میری، محبّت انتہا میری
محبّت سے عبارت ہے بقا میری، فنا میری

محبّت ہی مرے نزدیک معراجِ عبادت ہے
محبّت ہی مرے نزدیک سرتاجِ عبادت ہے
محبّت مبتدا میرا، محبّت منتہا میرا
حقیقت میں محبّت ہی محبّت ہے خدا میرا
محبّت ہی مری طاقت، محبّت ہی جوانی ہے
محبّت گر نہ ہو، ویران میری زندگانی ہے
محبّت میری دولت ہے، محبّت میری عظمت ہے
محبّت ہی سے مصرِ شعر پر میری حکومت ہے
محبّت کتنی ہی بے مایہ ہو شاہانہ رہتی ہے
خراب آبادِ دل میں صورتِ سلطانہ رہتی ہے
محبّت ہی سے روشن جلوہ زارِ کبریائی ہے
محبّت جس کو کہتے ہیں حقیقت میں خدائی ہے
شب و روز اک نیا پیغام لاتے ہیں محبّت کا
گل و انجم، مجھے نغمہ سناتے ہیں محبّت کا
سحر کی حور، جب زلفِ سمن پر گنگناتی ہے
محبّت رنگ و بو ہو کر فضا میں پھیل جاتی ہے

سرِ کہسار جب مستانہ بادل گھر کے آتے ہیں
محبّت کے حسیں اور خوشنما موتی لٹاتے ہیں
جواں مہتاب جب سطحِ فلک پر جگمگاتا ہے
محبّت کی حسین و مرمریں کرنیں لٹاتا ہے
عروسِ شام، شرماتی ہے جب دن کے نظاروں سے
محبت نیچی نظریں بن کے گرتی ہے ستاروں سے
سحر دم جب گھنی شاخوں میں چڑیاں چہچہاتی ہیں
محبت کی جہانگیری کے شیریں گیت گاتی ہیں
محبّت ہی نے مجھ کو درسِ گل چینی سکھایا ہے
اور اک مدّت سے اپنے باغ کا مالی بنایا ہے
وداعِ شب، اٹھالاتا ہے پائیں باغ میں مجھ کو
ستارہ صبح کا پاتا ہے پائیں باغ میں مجھ کو
سحر خیزی مری پھولوں کو بیداری سکھاتی ہے
مری آمد نوا سنجانِ گلشن کو جگاتی ہے
خوشی کی بے خودی بے حدّ و بے اندازہ ہوتی ہے
فضاؤں سے لپٹ جانے کی حسرت تازہ ہوتی ہے

اور اس کے بعد میں ہوتا ہوں اور وجدان کا عالم
محبت، شاعری، احساس اور ہیجان کا عالم
مزہ آتا ہے وہ رنگِ گل و آہنگِ بلبل میں
سحر سے شام کر دیتا ہوں اکثر گوشۂ گل میں
ہجومِ گل میں کھو جاتی ہیں اکثر چاندنی راتیں
مری معبود ہو جاتی ہیں اکثر چاندنی راتیں
چمن کے مست نظارے مجھے مسرور رکھتے ہیں
مرے دل کو گدازِ نغمہ سے معمور رکھتے ہیں
اسیرِ کیف کر دیتی ہے یہ پھولوں کی آبادی
مجھے خوشبو سے بھر دیتی ہے یہ پھولوں کی آبادی
شرابِ رنگ و بو ایسی برستی ہے نظاروں سے
لپٹ جاتا ہوں جوشِ بے خودی میں شاخساروں سے
ہر اک لمحہ چمن کا نشہ بن بن کر گزرتا ہے
کہ ہر پھول اور ستارہ جامِ مستی پیش کرتا ہے
اسی عالم میں یاد آتی ہیں کچھ بیتی ہوئی راتیں
جوانی کی بہاروں کا لہو پیتی ہوئی راتیں

گزشتہ زندگی دہراتے ہیں یہ چاند یہ تارے
سہے بچپن کے پھر دکھلاتے ہیں یہ چاند، یہ تارے
کہانی سی کوئی دہراتی ہیں یہ چاندنی راتیں
کہاں سے جا کے پھر لوٹ آتی ہیں یہ چاندنی راتیں
وہی ہیں چاند تارے اب بھی اور ویسی ہی رات اب بھی
مرا بچپن نہیں باقی وہی ہے کائنات اب بھی
مجھے جب یادِ ماضی حال سے بیزار کرتی ہے
تو مستقبل کی امید آکے دل کو پیار کرتی ہے
میں کھو جاتا ہوں آئندہ مسرت کے خیالوں میں
خوشی کا رنگ بھر دیتا ہوں ماضی کے ملالوں میں
محبت کی سی کوئی چیز پیدا دل میں ہوتی ہے
ستارے توڑ لانے کی تمنا دل میں ہوتی ہے
خوشی کے جذبے طوفاں سے بسا جاتے ہیں سینے میں
زمین و آسماں آکر سما جاتے ہیں سینے میں
مگر اک دل سمندر کا نشیمن بن نہیں سکتا
ذرا سا قطرہ طوفانوں کا مسکن بن نہیں سکتا

مرا دل ڈوبنے لگتا ہے اس انبارِ ارماں سے
یہ کشتی تہہ نشیں ہو جاتی ہے ٹکرا کے طوفاں سے
میں اس دُھن میں مکان و لامکاں کو بھول جاتا ہوں
خیالِ گلستاں میں گلستاں کو بھول جاتا ہوں
غرض کیا پوچھتی ہو مشغلہ اُلفت کے ماروں سے
یہ وحشی کھیلتے رہتے ہیں پھولوں سے بہاروں سے
اور اس وحشت میں چنتے پھرتے ہیں ہم پھول گلشن میں
صبا شاید گرا دے جا کر ان کو تیرے دامن میں

فریبِ ہستی

زندگیِ گزراں، عمرِ رواں کچھ بھی نہیں
ساقیا جام کہ بنیادِ جہاں کچھ بھی نہیں
اعتبارات پہ قائم ہے نظامِ ہستی
یہ زمیں کچھ بھی نہیں دورِ زماں کچھ بھی نہیں
ایک اُمیدِ خیالی پہ جئے جاتے ہیں
ورنہ بنیادِ حیاتِ گزراں کچھ بھی نہیں
کاکلِ دوست کا ہے ایک فریبِ رنگیں
ورنہ یہ سلسلۂ دورِ زماں کچھ بھی نہیں
نکہت و ناز و نواہائے حسیناں موہوم
کاکل و دیدہ و لبہائے بتاں کچھ بھی نہیں
زہرہ و ماہ و ثریا ہیں نگاہوں کی جھلک
آب جو، نکہتِ گل، بادِ وزاں کچھ بھی نہیں

لالہ و یاسمن و گل ہیں بہارِ دل کا فریب
سبزہ و گلکدہ و جوئے رواں کچھ بھی نہیں

سرو و شمشاد و صنوبر ہیں نظر کا دھوکا
شاخسار و چمن آبِ رواں کچھ بھی نہیں

رنگِ زیبائشِ رنگیں بدناں لا حاصل
طرزِ آرائشِ گل پیرہناں کچھ بھی نہیں

شفقِ آرائیِ لعلِ لبِ میگوں بے کار
غالیہ سائیِ گیسوئے بتاں کچھ بھی نہیں

میکدہ کاریِ چشم و نظر اک موجِ سراب
ارغواں کاریِ رخسار و دہاں کچھ بھی نہیں

مطربِ کہن و آہنگِ کہن ہے بے معنی
ساغرِ کہنہ و ساقیِ جواں کچھ بھی نہیں

بزمِ اسکندر و کاؤس ہے لایعنی شے
تختِ مقدونیہ و تاجِ کیاں کچھ بھی نہیں

حسن تو کچھ بھی نہیں، عشقِ جواں کچھ بھی نہیں
ہوش اے دل کہ جہانِ گزراں کچھ بھی نہیں

بلبلِ زار ہے فریاد و فغاں پہ مجبور
گرچہ مستقبلِ فریاد و فغاں کچھ بھی نہیں

ایک مستیِ ابد ہے رگ و پے میں ساری
دل کی نظروں میں خرابات جہاں کچھ بھی نہیں

ایک موہوم سی منزل کی طرف ہیں راہی
زہرہ و ماہ و نجوم گزراں کچھ بھی نہیں

اس زمانہ میں ہیں ایمان و وفا خوابِ کہن
یہ حقیقت بھی نہاں ہے تو عیاں کچھ بھی نہیں

اور ہی چیز ہے جو دل میں اتر جاتی ہے
نطقِ بیتاب و لبِ شعلہ چکاں کچھ بھی نہیں

اور بھی جنتیں ہیں مسجد میں عبادت کے سوا
اور صنم خانوں میں جز حسنِ بتاں کچھ بھی نہیں

زندگی ہی میں جو حاصل نہ ہو وہ کیا نعمت
وادیِ کوثر و گلزارِ جناں کچھ بھی نہیں

ایک ٹھوکر سے اڑا دیتے ہیں تختِ جم و کے
گو فقیرانِ درِ پیرِ مغاں کچھ بھی نہیں

رات دن کشمکشِ رنج والم ہے برپا — جان ہی کو نہ ہو راحت تو جہاں کچھ بھی نہیں

سبزۂ گور کی جنبش سے صدا آتی ہے — یہ جہاں آہ جہانِ گزراں کچھ بھی نہیں

کوئی شاداب حقیقت ہے، تو ہے بزمِ مغاں
ورنہ اختر یہ جہانِ گزراں کچھ بھی نہیں

اے ابرِ رواں

اے ابرِ رواں، جا سوئے وطن، جا سوئے وطن، اے ابرِ رواں
اور چوم آ جا کر روئے وطن، ابروئے وطن، اے ابرِ رواں
دامن میں چھپا لا، بوئے وطن، خوشبوئے وطن، اے ابرِ رواں
اے ابرِ رواں جا سوئے وطن، جا سوئے وطن، اے ابرِ رواں

اے ابرِ رواں!

اے ابرِ رواں، میرا غمِ دل، یارانِ وطن کو جا کے سُنا
اس بلبلِ دشتِ غربت کا افسانہ چمن کو جا کے سُنا
ہر سنبل و گل کو جا کے سُنا، ہر سرو و سمن کو جا کے سُنا
اے ابرِ رواں، جا سوئے وطن، جا سوئے وطن، اے ابرِ رواں

اے ابرِ رواں!

کہنا کہ دیارِ غربت میں اک غمزدہ روتا رہتا ہے
دن رات تمہاری فرقت میں منہ اشکوں سے دھوتا رہتا ہے
گلہائے سخن کو آنسوؤں کے تاروں میں پروتا رہتا ہے
اے ابرِ رواں، جا سوئے وطن، جا سوئے وطن، اے ابرِ رواں

اے ابرِ رواں!

کہنا کہ وطن سے ہو کے جُدا، ہم سیرِ گلستاں کھو بیٹھے
وہ صحنِ چمن، وہ جلوۂ مہ، وہ حُسنِ بہاراں کھو بیٹھے
وہ شوخیِ گل، وہ رنگِ سمن، وہ نکہتِ ریحاں کھو بیٹھے
اے ابرِ رواں، جا سوئے وطن، جا سوئے وطن، اے ابرِ رواں

اے ابرِ رواں!

کہنا کہ ہر اک راحت سے یہاں، بیگانہ سے ہیں، مہجور سے ہیں
قابو میں نہیں ہے یاد تری، اے خاکِ وطن مجبور سے ہیں
غمگین سے ہیں، غمدیدہ سے ہیں، رنجیدہ سے ہیں، رنجور سے ہیں
اے ابرِ رواں، جا سوئے وطن، جا سوئے وطن، اے ابرِ رواں

اے ابرِ رواں!

ایک خط

اے روحِ قرارِ بے قراراں — سامانِ سکونِ دل فگاراں
اے مرکزِ انتظارِ آغوش — عیدِ نگہ و بہارِ آغوش
اے لالہ رُخ و چمن تماشا — رشکِ گل و یاسمن تماشا
اے صبحِ بہار و شامِ مہتاب — اے خوابِ شباب و عشق شاداب
اے رونقِ نو بہارِ بستر — اے طالعِ کامگارِ بستر
اے جشن گہِ سعیدِ پہلو — نوروزِ نگاہِ و عیدِ پہلو
مدّت سے نہ لی خبر ہماری — حسرت زدہ ہے نظر ہماری
اے جانِ عزیز و روحِ محبوب — عرصے سے نہ خط لکھا نہ مکتوب
پہلے تو یہ بے رُخی نہیں تھی — الطاف میں یوں کمی نہیں تھی
محرومِ کرم نہ تھا دلِ زار — پامالِ الم نہ تھا دلِ زار
آخر کو یہ کج ادائیاں کیوں — ہم سے بے اعتنائیاں کیوں
اے جانِ بہار و رُوحِ گلشن — محروم ہے کیوں نظر کا دامن
دیدار کو دل ترس رہا ہے — آنکھوں سے لہو برس رہا ہے
اے ماہ رخ و ستارہ اندام — نیندیں ویراں ہیں راتیں ناکام

صدمے ہم جھیلتے ہیں شب بھر — انگاروں سے کھیلتے ہیں شب بھر
اے رو کشِ مہر و رشکِ مہتاب — دن کو مضطر ہیں، شب کو بیخواب
کیوں ہو گئیں اس طرح خفا تم — رہنے لگیں ہم سے کیوں جدا تم؟
کیوں بھول گئیں، وفا کے انداز — سیکھے کس سے جفا کے انداز؟
دل ہجر میں خون ہو رہا ہے — بادل کی طرح سے رو رہا ہے

اب بھی جو ترس نہ کھاؤ گی تم
زندہ ہم کو نہ پاؤ گی تم

بستی کی لڑکیوں کے نام

ایک شہری شاعر کا پیغام

چل اے نسیمِ صحرا، روح روانِ صحرا — میرا پیام لے جا سوئے بتانِ صحرا
صحرائی مہوشوں کی خدمت میں جاکے کہنا — بھولے نہیں تمہیں ہم اے دخترانِ صحرا
گر بس چلے تو آئیں اور درد دل سنائیں — تم کو گلے لگائیں ہم پھر میانِ صحرا
تم "نجد" میں پریشاں شہروں میں ہم ہیں حیراں — اللہ کی اماں ہو تم پر بتانِ صحرا
تم اس طرف غموں سے بے حال ہو رہی ہو — ہم اس طرف ہیں مضطر، دامن کشانِ صحرا
ہم پاس آئیں کیونکر، تم کو بلائیں کیونکر — یہ دکھ مٹائیں کیونکر، واماندگانِ صحرا

بیتاب ہیں الم سے، بیخواب رنج و غم سے — کیا پوچھتی ہو ہم سے، اے دلبرانِ صحرا

تم یاد کر رہی ہو، بیداد کر رہی ہو — برباد کر رہی ہو، اے گلرخانِ صحرا

یہ کیا کہا کہ "تم ہو رنگینیوں کے خوگر" — غمگیں ہیں تم سے بڑھ کر اے غمکشانِ صحرا

یہ رات یہ گھٹائیں، یہ شور یہ ہوائیں — بچھڑے ہوئے ملیں گے کیونکر، میانِ صحرا

شہروں کی زندگی سے ہم تنگ آ چکے ہیں — صحرا میں پھر بلا لو، اے ساکنانِ صحرا

"بادِ سموم" ہو یا "صرصر کے تند طوفاں" — ڈرتے نہیں کسی سے دلدادگانِ صحرا

آبادیوں میں حاصل، آزادیاں نہیں ہیں — آ جاؤ تم ہی اڑ کر، او طائرانِ صحرا

صحرا کی وسعتوں میں ہم کو نہ بھول جانا — او دخترانِ صحرا، او آہوانِ صحرا

اے ابر چپ نہ رہنا، میرا فسانہ کہنا — مل جائے گر کہیں وہ سروِ روانِ صحرا

دشتی کی دھن میں ساقی، اک نغمۂ عراقی
ہاں پھر سنا بیادِ گل چہرگانِ صحرا

آنکھوں میں بس رہا ہے نقشِ بتانِ صحرا — او داستاں سرا چھیڑ اک داستانِ صحرا

مستانہ جا رہا ہے پھر کاروانِ صحرا — ہاں جھوم کر حدی خواں اک داستانِ صحرا

دیہات کی فضائیں آنکھوں میں پھر رہی ہیں — دل میں سما رہی ہے یادِ بتانِ صحرا

نظروں پہ چھا رہا ہے وہ چاندنی کا منظر — صحرا میں کھیلتی تھیں جب حوریانِ صحرا

وہ چاندنی کا موسم، وہ بیخودی کا عالم — وہ نور کا سمندر، ریگِ روانِ صحرا

جلوے مہِ جواں کے، وہ رنگ کارواں کے — وہ نغمے ساربان کے، رقصاں میانِ صحرا

کیونکہ نہ یاد آئیں، وہ سیمگوں فضائیں
وہ آسمانِ صحرا، ماہِ روانِ صحرا

وہ کمسنوں کے گانے، وہ کھیل وہ ترانے
بے فکری کے فسانے، وردِ زبانِ صحرا

کھیتوں میں گھومتے تھے، ہر گل کو چومتے تھے
مستی میں جھومتے تھے جب میکشانِ صحرا

وہ گاؤں وہ فضائیں، وہ فصل، وہ ہوائیں
وہ کھیت وہ گھٹائیں، وہ آسمانِ صحرا

پھر یاد آ رہی ہیں، پھر دل دکھا رہی ہیں
مجنوں بنا رہی ہیں لیلیٰ وشانِ صحرا

راتوں کو چھپ کے آنا اور ستانے کو بلانا
ہے یاد وہ جگانا ہم کو میانِ صحرا

وہ اُن کی شوخ آنکھیں، وہ ان کی سادہ نظریں
بیخود بنا رہی ہیں دوشیزگانِ صحرا

وہ عشق پیشہ ہوں میں، جس کے جوان نغمے
گاتا ہے چاندنی میں ہر نوجوانِ صحرا

اک بدویت کا عاشق، صحرائیت سے بیخود
اخترؔ بھی اپنی دھن میں ہے اک جوانِ صحرا

طلوعِ محبّت سے پہلے

جب تلک دل میں محبّت نہ ہوئی تھی پیدا
یہ زمیں سادہ تھی، جنّت نہ ہوئی تھی پیدا
زندگی میں کوئی لذّت نہ ہوئی تھی پیدا
ذہن اور فکر میں عظمت نہ ہوئی تھی پیدا
جب تلک دل میں محبّت نہ ہوئی تھی پیدا

میرے افکار کے پھولوں میں بہار آئی نہ تھی
میرے اشعار میں رنگینی و رعنائی نہ تھی
میری تخئیل میں ندرت نہ ہوئی تھی پیدا
جب تلک دل میں محبّت نہ ہوئی تھی پیدا

بے اثر تھی، مری نظروں میں ستاروں کی بہار
کتنی افسردہ تھی قدرت کے نظاروں کی بہار
کسی منظر میں لطافت نہ ہوئی تھی پیدا
جب تلک دل میں محبّت نہ ہوئی تھی پیدا

آرزوئیں تھیں نہ یہ حُسن بھرا خواب اُن کا
نہ اُمنگیں تھیں نہ یہ نشّۂ شاداب اُن کا
کسی جذبے میں طراوت نہ ہوئی تھی پیدا
جب تلک دل میں محبّت نہ ہوئی تھی پیدا

یہ جہاں سادہ تھا بے کیف تھا یا غم زدہ تھا
ایک اک ذرّہ پریشان تھا، ماتم زدہ تھا
باغِ ہستی میں مسرّت نہ ہوئی تھی پیدا
جب تلک دل میں محبّت نہ ہوئی تھی پیدا

نہ گھٹاؤں میں تھا یہ رنگِ خراماں پہلے
نہ ہواؤں میں تھی یہ بوئے پریشاں پہلے
رنگ و بو میں یہ حلاوت نہ ہوئی تھی پیدا
جب تلک دل میں محبت نہ ہوئی تھی پیدا

حسن خنداں تھا نہ دیوانے نظر آتے تھے
شمع روشن تھی نہ پروانے نظر آتے تھے
یہ جنوں اور یہ وحشت نہ ہوئی تھی پیدا
جب تلک دل میں محبت نہ ہوئی تھی پیدا

مصرِ افکار تھا بیگانہ زلیخاؤں سے
میرے ارماں کدے محروم تھے سلماؤں سے
فکر اور شعر میں لذت نہ ہوئی تھی پیدا
جب تلک دل میں محبت نہ ہوئی تھی پیدا

شیریں آئی تھی نہ ایراں کی فضا سے اب تک
کوئی بلقیس نہ اٹھی تھی سبا سے اب تک
اور سلیماں کی عظمت نہ ہوئی تھی پیدا
جب تلک دل میں محبت نہ ہوئی تھی پیدا

ایک نوجوان بُت تراش کی آرزو

اک ایسا بُت بناؤں کہ دیکھا کروں اُسے
آسودہ ہے خیال کا پیکر بنا ہوا
خوابِ عدم میں مست ہے جوہر بنا ہوا
اک مرمریں حجاب سے پیدا کروں اُسے
پھولوں میں جیسے جذبۂ نکہت نہفتہ ہو
یا جلوے بے قرار ہوں امواجِ رنگ میں
یوں اُس کی رُوح خفتہ ہے آغوشِ سنگ میں
ظلمت میں جیسے نُور کی صورت نہفتہ ہو

○

دن رات، صبح و شام، میں پُوجا کروں اُسے
میرا گدازِ روح جبیں سے مچل پڑے
اس کی نظر سے جذبِ محبّت اُبل پڑے
سازِ نفس کو توڑ کے گویا کروں اُسے
فن، خوابِ مرگ بن رہے بُت ساز کے لیے
دُنیا پکارتی رہے آواز کے لیے

چودھویں سالگرہ کا تحفہ

ستارے نذر کروں؟ آفتاب نذر کروں؟
کلی کا حسن، گلوں کا شباب نذر کروں؟

ریاضِ خلد کی شادابیاں کروں حاضر؟
نگاہِ حور کا رنگیں حجاب نذر کروں؟

صباحتِ رخِ شیریں کا ارمغاں بھیجوں؟
لبِ سلمیٰ کا لعلِ خوش آب نذر کروں؟

غزالِ دیدۂ لیلائے نجد بھجوا دوں؟
خمارِ چشمِ زلیخا کا خواب نذر کروں؟

کھلونا چاہیے گر کوئی کھیلنے کے لیے
چراغِ زہرہ کا زریں ایاغ نذر کروں؟

یہ سن ہے وہ کہ ستاروں سے بھی پرے ضرور
شعاعِ مہر کا زریں نقاب نذر کروں؟

مطالعے کی تمنا ہو گر نگاہوں کو
تو کہکشاں کی طلائی کتاب نذر کروں؟

مذاقِ شعر کی لازم اگر رعایت ہو
تو شاعرانِ جہاں کا جواب نذر کروں؟

زبسکہ سالگرہ چودھویں ہے حسرت ہے
کہ میں بھی چودھویں کا ماہتاب نذر کروں؟

قبول ہوں نہ یہ تحفے تو کیا کروں آخر؟
کہو تو میں دلِ خانہ خراب نذر کروں؟

نغمۂ زندگی

بربطِ کائنات پر، نغمہ سرا ہے زندگی
مست نوا ہے زندگی

وادیِ مہر و ماہ تک بال کشا ہے زندگی
جلوہ نما ہے زندگی

جس کی کچھ ابتدا نہیں، جس کی کچھ انتہا نہیں
جس کو کبھی فنا نہیں
خواب گہِ فنا میں وہ موجِ صدا ہے زندگی
رقصِ صبا ہے زندگی

موسمِ شعلہ بار میں، دامنِ کشت زار میں
سینۂ کاشتکار میں
بن کے لہو کا اضطراب، ہمہمہ زا ہے زندگی
نغمہ سرا ہے زندگی

جام ہیں مختلف تو ہوں، اُن میں شراب ایک ہے
بادۂ ناب ایک ہے
سازِ فنا میں مشترک، ایک صدا ہے زندگی
ایک نوا ہے زندگی

رہ روِ راہِ ارتقا کے لیے اک مقام ہے
راہزنِ خرام ہے
لے کے عدم سے تا عدم ایک فضا ہے زندگی
راہ نما ہے زندگی

اس کی ہوائے تُند پر تیر رہی ہے کائنات
مستِ شرابِ حیات
طائرِ دہر کے لیے ایک فضا ہے زندگی
کیا کہوں کیا ہے زندگی؟

سلام کے جواب میں

سلام اس پر کہ جس نے سلام بھیجا ہے
نگاہِ ناز کا رنگیں پیام بھیجا ہے
سلام اس پہ کہ گر اس کی مدحِ ناز کروں
ذرا سی عمر کو میں حشر تک دراز کروں
سلام اس پہ فدا جس پہ ہر حسین کی بہار
بہشت کے گل و نسترن و نسترن کی بہار
سلام اس پہ جسے حورِ کہکشاں کہیے
زمیں کے شب کدے میں نورِ آسماں کہیے

وہ مہ جبیں جسے تارے بھی پیار کرتے ہیں — اور اس کے قدموں پہ کرنیں نثار کرتے ہیں

مہ و ستارہ کا پیکر، رخِ حسیں اس کا — بہار و نور کا بت، جسم مرمریں اس کا

وہ گل بدن کہ اگر سیرِ گل کو آ جائے — غرورِ گل کی نزاکت کا سب مٹا جائے

شمیمِ زلف سے سو جنتیں مہک جائیں — نگاہِ مست سے میخانے تک بہک جائیں

وہ زلفِ تیرہ کہ دن ہو تو رات ہو جائے — سیاہ آنکھوں میں کل کائنات کھو جائے

وہ شوخ آنکھیں، جہاں بجلیاں مچلتی ہیں — وہ نظریں جن سے جواں مستیاں ابلتی ہیں

کشیدہ ابرو، ہلالِ سیاہ کہیے جنھیں — کئی دلوں کا مآلِ سیاہ کہیے جنھیں

شفق سے گل سے سمن سے بنے ہوئے عارض — بہارِ باغِ عدن سے بنے ہوئے عارض

وہ لعلِ لب کہ جنھیں آرزوئیں پیار کریں — بہشتیں، غنچوں کی شادابیاں نثار کریں

خرامِ ناز، کہ موجِ نسیم رک جائے — صدائے شوخ کہ قدموں پہ زہرہ جھک جائے

بتانِ شہر میں وہ اس طرح نمایاں ہے — کہ جیسے تاروں میں ماہِ جواں درخشاں ہے

نسیم کی طرح جس دم چمن میں آتی ہے — چمن کی ہر کلی مدحت کے گیت گاتی ہے

وہ پھول ہے کہ بہاروں کا جس پہ سایہ ہے — وہ چاند ہے کہ ستاروں کا جس پہ سایہ ہے

برنگِ مدح یہ "تازہ کلام" حاضر ہے — اور اس زباں میں "جوابِ سلام" حاضر ہے

امیدِ دل کی کلی کھل کے پھول ہو جائے

ہماری نذرِ محبت، قبول ہو جائے

دُعا

تاروں بھری رات سو رہی ہے
فطرت مدہوش ہو رہی ہے

ہیں وادی و کوہسار خاموش
ہر پھول، ہر آبشار خاموش

اس اُجلے سمے میں اک پری ہے
گویا کوئی شکل مرمری ہے

کم سن، معصوم، بھولی بھالی
چہرے پہ گلاب کی سی لالی

اک دُکھ بھرا گیت گا رہی ہے
روتی ہوئی اڑتی جا رہی ہے

پھیلائے ہوئے ہے اپنا دامن
ہونٹوں پہ ہے دل گداز شیون

بکھرے ہوئے بال اڑ رہے ہیں
ظلمات کے جال اُڑ رہے ہیں

غمگیں نظریں اُٹھا رہی ہے
اور تاروں کی سمت جا رہی ہے

خالق کے حضور میں چلی ہے
کچھ رحم کی بھیک مانگتی ہے

آنکھوں میں چھلک رہے ہیں آنسو
گالوں پہ ڈھلک رہے ہیں آنسو

سازِ زخمی کی ہے صدا یہ
ٹوٹے ہوئے دل کی ہے دعا یہ

عشق و آزادی

عشق و آزادی بہارِ زیست کا سامان ہے
عشق میری جان، آزادی مرا ایمان ہے
عشق پر کر دوں فدا میں اپنی ساری زندگی
لیکن آزادی پہ میرا عشق بھی قربان ہے

سلمیٰ نورجہاں کے مزار پر

فضائے غم میں مسرت سی جھلملائی ہے
خزاں کی شام پہ صبحِ بہار چھائی ہے
مزارِ نورجہاں پر وہ شوخ آئی ہے

گماں ہے خلد سے حورِ جناں نکل آئی
نقابِ گل سے شمیمِ نہاں نکل آئی
کہ اپنی قبر سے نورِ جہاں نکل آئی

اندھیرے مقبرے میں غم سے یوں پریشاں ہے
فضا کی گود میں گویا کہ شمعِ گریاں ہے
شبِ سیاہ میں سیّارہ اشک افشاں ہے

طلائی ہاتھ اُٹھے کس کے فاتحہ کے لیے
فضائیں ہو گئیں بیتاب التجا کے لیے
خدائی کانپ اُٹھی جذبۂ دعا کے لیے

یہ رنگ دیکھ کے رنجور ہو رہا ہوں میں　　شرابِ درد سے مخمور ہو رہا ہوں میں
بیانِ حال پہ مجبور ہو رہا ہوں میں

گداز دل میں ، جنوں سر میں ، لب پہ شیون بھی　　وہ شیون آہ کہ رو دے وہ چشم پُرفن بھی
مگر میں کیا کروں ، ہے ساتھ شیر افگن بھی

الٰہی گر اُسے نورِ جہاں بنانا تھا　　مرے نصیب کو یوں کامراں بنانا تھا
مجھے بھی خسروِ ہندوستاں بنانا تھا

کہ ایک دن یہی نورِ جہاں مری ہوتی　　جو آج غیر کی ہے دلستاں ، مری ہوتی
یہ غمزدہ یہ دلِ شادماں مری ہوتی

یہ کس نے چپکے سے تربت کی سمت اشارہ کیا　　بتا کے حُسن کا انجام ، دل دو پارہ کیا
اور اپنا رازِ غمِ عشق آشکارا کیا

یہ کس کو شکوہ ہے تربت کی بے نوائی کا　　مزارِ شوہرِ ملکہ کی غم نمائی کا
اور اس کے ساتھ ہی مردوں کی بیوفائی کا

اٹھی ہیں قبر پہ یہ کس کی سوگوار آنکھیں　　کہ ذرّے ذرّے کی ہیں غم سے بیقرار آنکھیں
فضا میں کچھ نہیں باقی بجز اشکبار آنکھیں

شعاعِ ماہ جواں کو فگار دیکھا ہے ؟　　شمیمِ خلد کو ماتم گسار دیکھا ہے ؟
کسی نے حُسن کو یوں سوگوار دیکھا ہے ؟

دعوت

بہار بیتنے والی ہے آبھی جا سلمیٰ

بہار بیتنے والی ہے آبھی جا سلمیٰ — چمن کی گود میں آکر سما بھی جا سلمیٰ
کلی کلی میں بہاریں بسا بھی جا سلمیٰ — مجھے جنوں کا سبق پھر پڑھا بھی جا سلمیٰ

بہار بیتنے والی ہے آبھی جا سلمیٰ

"ملیں گے حشر میں" مت کہہ یہ بار بار مجھے — ہو کیسے حشر کے وعدے پہ اعتبار مجھے
خدا کے دل پہ نہیں کوئی اختیار مجھے — خدا کو مان، یہیں حشر اٹھا بھی جا سلمیٰ

بہار بیتنے والی ہے آبھی جا سلمیٰ

نشاطِ عمر کو امید پر نثار نہ کر — وصالِ صبحِ قیامت کا انتظار نہ کر
ریاضِ خلد کی باتوں کا اعتبار نہ کر — فریبِ وعدۂ فردا مٹا بھی جا سلمیٰ

بہار بیتنے والی ہے آبھی جا سلمیٰ

کسے خبر ہے قیامت میں ہم ملیں نہ ملیں — فضائے روضۂ جنت میں ہم ملیں نہ ملیں
کشاکشِ ابدیت میں ہم ملیں نہ ملیں — کشاکشِ ابدیت بھلا بھی جا سلمیٰ

بہار بیتنے والی ہے آبھی جا سلمیٰ

گنوا نہ سوگ میں اپنے شباب کی راتیں — نظر نہ آئیں گی پھر ماہتاب کی راتیں
یہ نکہتوں کا ہجوم اور یہ خواب کی راتیں — فضا میں خوابِ حسیں بن کے چھا بھی جا سلمیٰ

بہار بیتنے والی ہے آبھی جا سلمیٰ

خبر ہے جلد کہ عمرِ عزیز فانی ہے — سرائے دہر کی ہر چیز آنی جانی ہے
برنگِ ابرِ رواں فصلِ نوجوانی ہے — چھلکنے والا ہے ساغر پلا بھی جا سلمیٰ
بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ

کسے خبر یہ گھٹائیں رہیں رہیں نہ رہیں — یہ نکہتیں یہ ہوائیں رہیں رہیں نہ رہیں
یہ مستیاں یہ فضائیں رہیں رہیں نہ رہیں — شرابِ وصل کا ساغر پلا بھی جا سلمیٰ
بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ

ثباتِ عہد زمانے میں کس نے پایا ہے — زمانہ رنگ بدلنے کو رنگ لایا ہے
بہارِ عمرِ رواں بادلوں کا سایا ہے — بہارِ عمر کی خوشیاں منا بھی جا سلمیٰ
بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ

ترے خیال کو دل میں بسائے بیٹھے ہیں — خدائی ہو کہ خدا ہو بھلائے بیٹھے ہیں
سرورِ عہدِ جوانی لٹائے بیٹھے ہیں — تو آ کے قدرِ جوانی سکھا بھی جا سلمیٰ
بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ

یہ فصل اور یہ بہاریں نظر نہ آئیں گی پھر — یہ بادلوں کی قطاریں نظر نہ آئیں گی پھر
یہ ہلکی ہلکی پھواریں نظر نہ آئیں گی پھر — شرابِ عیش و مسرت لنڈھا بھی جا سلمیٰ
بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ

بتا تو کیا یہ نظارے اُجڑ نہ جائیں گے؟ — یہ ندیاں یہ کنارے اُجڑ نہ جائیں گے؟
یہ چاند اور یہ ستارے اُجڑ نہ جائیں گے؟ — ستارہ وار شعاعیں لٹا بھی جا سلمیٰ
بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ

غموں پہ کی ہیں فدا شادمانیاں ہم نے — خدا کے نام پہ تج دیں جوانیاں ہم نے
گزار دیں ہیں یونہی زندگانیاں ہم نے — دمِ اخیر تو غم سے چھڑا ابھی جا سلمیٰ

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ

فنا نصیب ہیں یہ سبزہ زار کے منظر — یہ کوہسار و لبِ جوئبار کے منظر
نظر نہ آئیں گے، پھر یہ بہار کے منظر — ابھی سماں ہے بہاریں دکھا ابھی جا سلمیٰ

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ

خبر لے جلد کہ بہکی ہوئی بہار ہے آج — نشاطِ خلد سے معمور سبزہ زار ہے آج
اجل پہ بھی مری ہستی کو اختیار ہے آج — غرورِ عشق کی ہمت بڑھا ابھی جا سلمیٰ

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ

تو حکم دے تو ستاروں کو چھین لاؤں میں — فلک سے اس کے نظاروں کو چھین لاؤں میں
ارم کی مست بہاروں کو چھین لاؤں میں — خدائی کو یہ تماشا دکھا ابھی جا سلمیٰ

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ

تو سامنے ہو تو کون و مکاں کو گم کر دوں — خمِ طرب میں خمِ آسماں کو گم کر دوں
دوئی ہو فرد تو دونوں جہاں کو گم کر دوں — بہ رنگِ روح بدن میں سما ابھی جا سلمیٰ

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ

شکوہ

میری خوابیدہ امیدوں کو جگایا کیوں تھا
دل جلانا تھا تو دل تم نے لگایا کیوں تھا؟

مجھ کو اس طرح گرانا تھا اگر نظروں سے
پھر مرے عشق کو سینے میں بسایا کیوں تھا؟

اک "شکستہ سا کھلونا" ہی سہی دل میرا
اس کو تحفے کی طرح تم نے منگایا کیوں تھا؟

غیر کی یاد کو ممنون اگر کرنا تھا
خلوتِ دل میں مرے غم کو بسایا کیوں تھا؟

عشق تھا تم کو تو دل میں اسے پنہاں رکھتیں
اپنا یہ رازِ حسیں مجھ کو بتایا کیوں تھا؟

"چاندنی رات" میں "الفت کا سبق" دینے کو
مجھ کو "جمنا" کے کنارے پہ بلایا کیوں تھا؟

عمر بھر پاس نہ آنے کا ارادہ تھا اگر
پھر مجھے دور سے دیوانہ بنایا کیوں تھا؟

میری راتوں میں سمائے ہیں تمہارے کاکل
تم نے یہ خواب مجھے آہ دکھایا کیوں تھا؟

یاس کی نیند سلانا ہی اگر تھا منظور
میری اُمید کی راتوں کو جگایا کیوں تھا؟

اتنی خوددار اگر تھیں تو مرے دل کے عوض
اپنا سب کچھ مرے قدموں پہ لٹایا کیوں تھا؟

تلخ انجامیِ الفت سے اگر ڈرتی تھیں
یہ خطرناک سبق مجھ کو پڑھایا کیوں تھا؟

روٹھ جانا ہی اگر حسن کا شیوہ ٹھہرا
میری روٹھی ہوئی قسمت کو منایا کیوں تھا؟

"آؤ اب صلح کریں، عشق کریں، پیار کریں"
مجھ کو یہ زمزمۂ شوق سنایا کیوں تھا؟

ولولہ اپنی محبت کا گھٹانا تھا اگر
حوصلہ میری تمنّا کا بڑھایا کیوں تھا؟

اُٹھ نہ سکتا تھا اگر صدمۂ فرقت تم سے
پھر مرے دل کا عبث ناز اٹھایا کیوں تھا؟

نالۂ درد کی تلخی سے اگر نفرت تھی
بربطِ عشق کے تارِ سُن کو جگایا کیوں تھا؟
لَے اِس طرح لگائی تھی اگر مہرِ سکوت
پھر مجھے نغمۂ اُمیدِ سُنایا کیوں تھا؟
بے نیازی ہی سکھانی تھی اگر جلووں کو
میرے خوابوں کی فضاؤں کو بسایا کیوں تھا؟
نامۂ شوق ہمیشہ جو نہ لکھ سکتی تھیں
بندگی نامۂ عبث ہم سے لکھایا کیوں تھا؟
پاس کرنا تھا اگر اپنی نزاکت کا تمھیں
دل پہ پھر بارِ غمِ عشق اٹھایا کیوں تھا؟
وادیوں میں لیے پھرتا تھا اگر شوقِ شکار
دُور سے میری طرف تیر چلایا کیوں تھا؟
بادۂ عشق میں ایسی ہی اگر تلخی تھی
پہلے اِس جام کو ہونٹوں سے لگایا کیوں تھا؟
گر نظر آتی تھی دشوار وفا کی منزل
پھر قدم راہِ محبت میں اٹھایا کیوں تھا؟
میرے سجدوں کے لیے اور ٹھکانے تھے بہت
آستاں اپنا مجھے تم نے بتایا کیوں تھا؟

الغرض، عشق کا بھولا ہوا یہ تلخ سبق
بھولنے والی! مجھے یاد دلایا کیوں تھا؟

عید کا چاند

ریگستانِ عرب میں

عرب کی شام کا دلکش سماں ہے
فضا سے کیفِ رنگینی عیاں ہے
سوئے منزل رواں اک کارواں ہے

مسافر ہیں، تھکے ہیں، جا رہے ہیں　　حُدی کے مست نغمے گا رہے ہیں

سکونِ دشت کو تڑپا رہے ہیں

یہ صحرا ہے کہ ہے دامانِ نکہت　　سوادِ شام ہے یا جانِ نکہت

بپا ہے چار سو طوفانِ نکہت

مسافر مست تھے کیفِ نوا سے　　کہ ماہِ عید نے جھانکا فضا سے

ہر اک بے خود ہوا ذوقِ دعا سے

ہیں سجدے شکر کے مضطر جبیں میں　　ہے سر خم درگہ جاں آفریں میں

سرشکِ شوق ہیں چشمِ حزیں میں

ہلالِ عید بر روئے فلک ہے　　کہ قوسِ سیم ابروئے فلک ہے

طلائی کشتی اور جوئے فلک ہے

طراوت آ گئی موجِ صبا میں　　بہاریں کھیلتی ہیں اس فضا میں

بسی ہے عید کی نکہت ہوا میں

عرب کی شام کا دلکش سماں ہے　　فضا سے کیفِ رنگینی عیاں ہے

سوئے منزل رواں اک کارواں ہے

آج کی رات

کتنی شاداب ہے دنیا کی فضا آج کی رات
کتنی سرشار ہے گلشن کی ہوا آج کی رات
کتنی فیاض ہے رحمت کی گھٹا آج کی رات
کس قدر خوش ہے خدائی سے خدا آج کی رات
کہ نظر آئے گی وہ ماہ لقا آج کی رات

کیوں نہ گلزار میں اٹھلاتی پھرے موجِ نسیم
کیوں نہ ہر پھول ہو لبریز بہارِ تسنیم
کیوں نہ آمادۂ افلاک ہو پروازِ شمیم
کیوں نہ ہر ذرہ بنے جلوہ گہِ طورِ کلیم
کہ انہیں دیکھیں گے ہم جلوہ نما آج کی رات

آج کیا بات ہے، دنیا کے نظارے خوش ہیں
باغ میں پھول، سرِ چرخ ستارے خوش ہیں
ایک بے نام سی سرمستی کے مارے خوش ہیں
ایک میں خوش نہیں، جتنے بھی ہیں سارے خوش ہیں
ہے خوشی چار طرف نغمہ سرا آج کی رات

غائبانہ جو ہمیں نامے لکھا کرتی تھی
دُور سے ہم پہ دل اپنا جو فدا کرتی تھی
دادِ اشعار جو "گمنام" دیا کرتی تھی
ہو کے بے پردہ جو پردے میں رہا کرتی تھی
سامنے ہوگی وہی شوخ ادا آج کی رات

جس کی رنگینی سے افکار ہیں بیہوش مرے
جس کی اُلفت سے ہیں اشعار پُر از جوش مرے
جس کی فرقت میں خیالات ہیں غم کوش مرے
جس کے جلووں سے تصور ہیں ہم آغوش مرے
جلوہ دکھلائے گی وہ حُور لقا آج کی رات

داستانِ دلِ بے تاب سنائیں گے انھیں
آپ روئیں گے، گلے مل کے رُلائیں گے انھیں
خود ہی پھر رونے پہ ہنس دیں گے ہنسائیں گے انھیں
اور جرأت کی تو سینے سے لگائیں گے انھیں

نت نئے جذبوں کی ہے نشو و نما آج کی رات

دل کی رگ رگ میں ہے بیتاب محبت اُس کی
آنکھ کے پردے پہ لہراتی ہے صورت اُس کی
خلوتِ روح میں آباد ہے الفت اُس کی
میرے جذبات پہ طاری ہے لطافت اُس کی

اور کچھ یاد نہیں اس کے سوا آج کی رات

نکہتِ حسن ہو دامانِ ہوا میں رقصاں
جذبۂ عشق ہو رنگین فضا میں رقصاں
کیف و سرمستی ہو منظر کی ادا میں رقصاں
نور ہی نور ہو یوں ارض و سما میں رقصاں

کہ خدائی میں اُتر آئے خدا آج کی رات

واقفِ دردِ دلِ زار کریں گے اُن کو
غمِ اُلفت سے خبردار کریں گے اُن کو
محرمِ جذبۂ اسرار کریں گے اُن کو
گود میں لیں گے انھیں پیار کریں گے اُن کو

دل کی رگ رگ سے یہ آتی ہے صدا آج کی رات

لیکن اظہارِ خیالات کریں گے کیونکر؟
شرم آتی ہے، ملاقات کریں گے کیوں کر؟
بات کرنی ہے مگر بات کریں گے کیونکر؟
ختم یہ خواب کی سی رات کریں گے کیوں کر؟

آہ! یہ آج کی، یہ خواب نما آج کی رات

اے دل ایسا نہ ہو کچھ بات بنائے نہ بنے
حالِ دل جو بھی سنانا ہے سنائے نہ بنے
پاس آئیں تو، مگر پاس بٹھائے نہ بنے
شرم کے مارے انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

کہ تصوّر سے بھی آتی ہے حیا آج کی رات

یوں تو ہر طرح ادب مدِّ نظر رکھنا ہے
حسرتِ دل کا لحاظ آج، مگر رکھنا ہے

بے خودی! دیکھ تجھے میری خبر رکھنا ہے
نازنیں قدموں پہ یوں ناز سے سر رکھنا ہے

کہ تڑپ اُٹھے دلِ ارض و سما آج کی رات

ہم ہیں کچھ جرأتِ گویائی بھی ہو گی کہ نہیں
ہمتِ ناصیہ فرسائی بھی ہو گی کہ نہیں

شرم سے دورِ شکیبائی بھی ہو گی کہ نہیں
یوسفِ دل سے زلیخائی بھی ہو گی کہ نہیں

آج کی رات اُف اے میرے خدا آج کی رات

انگوٹھی

چھپاؤں کیوں نہ دل میں خاتمِ گوہر نگار اُس کی
یہی دے کے میرے پاس ہے اک یادگار اس کی

یہ تنہائی میں میرے لب تک آ کر مسکراتی ہے
اور اپنی مالکہ کی طرح دل کو گدگداتی ہے

قلم کے ساتھ میرے ہاتھ میں ہر وقت رہتی ہے
اور اُس کے دستِ رنگیں کے فسانے مجھ سے کہتی ہے

طلائی انگلیوں کا جب مجھے قصہ سناتی ہے
تصور میں ستاروں کے سے پیکر کھینچ لاتی ہے

مری سلمیٰ کو اس نے شاد اور ناشاد دیکھا ہے
گہے مسرور گاہے مائلِ فریاد دیکھا ہے

اسے معلوم ہیں اچھی طرح بیتابیاں اس کی
نہیں پوشیدہ اس کی آنکھ سے بے خوابیاں اس کی

شبِ تنہائی میں اس نے اسے بیدار پایا ہے
اور اکثر دیدۂ سرشار کو خونبار پایا ہے

اسے معلوم ہے وہ کس طرح مغموم رہتی تھی
کسی کے غم میں لطفِ زیست سے محروم رہتی تھی

مرا خط پڑھ کے وہ کس ناز سے مسرور ہوتی تھی
پھر اپنی بے بسی پر کس طرح رنجور ہوتی تھی

یہ شاہد ہے کہ اس کی شامِ غم کیوں کر گزرتی تھی
یہ شاہد ہے کہ وہ رو رو کے کیونکر صبح کرتی تھی

وہ جب دل تھام لیتی تھی ہجومِ غم سے گھبرا کر
تو یہ کرتی تھی اس کی غمگساری اس کے پاس آ کر

اسے معلوم ہیں جو درد تھا اُس پاک سینے میں
بسی ہیں اس کے دل کی دھڑکنیں اس کے نگینے میں

پہنچتی ہیں شعاعیں اس کی حسنِ چشمِ حیراں تک
تصور مجھ کو لے اُڑتا ہے سلمیٰ کے شبستاں تک

جہاں سلمیٰ کے اور میرے سوا ہوتا نہیں کوئی
انگوٹھی کھوئی جاتی ہے مگر کھوتا نہیں کوئی

رقّاصہ

سکوتِ شب میں یہ حسینہ کون، زہرہ وار بجلوۂ ادائے رقص ہے
کہ جس کے رقصِ ناز سے فضائے مشک بو بنی ہوئی فضائے رقص ہے

اُٹھی ہوئی ہتھیلیوں کی جنبشیں، تُلی ہوئی کمر کی ہلکی گردشیں
زمیں سے آسماں تک آج جیسے ایک ایک جلوہ مبتلائے رقص ہے

ادھر وہ جسمِ احمریں لچک گیا، اُدھر وہ ایک رقص بن کے رہ گئی
اگر وہ اس کی ابتدائے رقص تھی تو اس کو کہیے انتہائے رقص ہے

کبھی کچھ ایسے، جیسے وہ پھسل گئی، کبھی کچھ ایسے، جیسے پھر سنبھل گئی
کبھی تڑپ اُٹھی، کبھی مچل گئی، غرض عجیب ماجرائے رقص ہے

وہ ایک پھول ہے جو بے قرار ہے، وہ ایک شعلہ ہے جسے سکوں نہیں
کہ ایک نغمہ ہے جو آگ کے شکل میں، ہوا کی طرح مبتلائے رقص ہے

سرورِ رقص نے دکھا دیے جگہ جگہ ہزاروں رقص کے صنم کدے
کہ اس کے پائے یاسمیں کی ایک ایک ہلکی لغزش اک بنائے رقص ہے

صفات و ذات کی فضول ہے یہ بحث، رنگ و برگِ گل، جدا جدا نہیں
وہ نغمہ ہے، وہ رقص ہے، وہ رقص نغمہ ہے، وہ انتہائے رقص ہے

دماغ مستِ فکر اور فکر مجھ عاجزی کہ اختتو اس کو کیا کہوں؟
جو شیخِ شہر کی نظر معاف کردے تو کہوں یہ اک خدائے رقص ہے

مجھے بددعا نہ دے

او نازنیں! خدا کے لیے بددعا نہ دے

میں بے وفا سہی، مجھے دادِ وفا نہ دے
میری خطا کو اپنے کرم کا صلہ نہ دے
غفلت کی دے سزا، مگر ایسی سزا نہ دے

او نازنیں! خدا کے لیے بددعا نہ دے

تسلیم ہے کہ تجھ کو ستا رہا ہوں میں
تیرے حسین دل کو دکھا رہا ہوں میں
لیکن تو اس طرح مرے دل کو دکھا نہ دے

او نازنیں! خدا کے لیے بددعا نہ دے

اقرار ہے مجھے کہ گنہ گار ہوں ترا مجرم ہوں، بے وفا ہوں، خطاوار ہوں ترا

لیکن تو رحم کر، مجھے ایسی سزا نہ دے

او نازنیں! خدا کے لیے بد دعا نہ دے

یہ کیا کہا: خدا کرے تیرا بھی آئے دل میری ہی طرح تیرا بھی کوئی دکھائے دل

اور دل بھی یوں دکھائے کہ قدرت شفا نہ دے

او نازنیں! خدا کے لیے بد دعا نہ دے

مانا کہ تیرے عشق کو دل سے بھلا دیا نقشِ وفا کو سینے سے اپنے مٹا دیا

لیکن تو میری پچھلی وفائیں بھلا نہ دے

او نازنیں! خدا کے لیے بد دعا نہ دے

تیرے غموں پہ کیوں مری اب تک نظر نہ تھی کیا ہو گیا تھا مجھ کو، مجھے خود خبر نہ تھی

اس بے خودی کی مجھ کو خدارا سزا نہ دے

او نازنیں! خدا کے لیے بد دعا نہ دے

گو آسماں نے تجھ سے جدا کر دیا مجھے بیگانۂ خیالِ وفا کر دیا مجھے

لیکن تو داغِ ترکِ خیالِ وفا نہ دے

او نازنیں! خدا کے لیے بد دعا نہ دے +

کالج کے مشغلوں نے ترا غم بھلا دیا پردیس کی فضا نے وہ عالم بھلا دیا

پردیسیوں کو، دل سے مگر تو بھلا نہ دے

او نازنیں! خدا کے لیے بد دعا نہ دے

مدت سے خط لکھا نہ تجھے یاد ہی رکھا تیری ہر اک اُمید کو ناشاد ہی رکھا
آئندہ کی اُمید کو لیکن مٹا نہ دے
او نازنیں! خدا کے لیے بد دعا نہ دے

اپنے کیے پہ آپ ہی پچھتا رہا ہوں میں تیری نگاہِ درد سے شرما رہا ہوں میں
دل سے بھلائے، اپنی نظر سے گرا نہ دے
او نازنیں! خدا کے لیے بد دعا نہ دے

گذرے ہوئے دنوں کا خیال آ رہا ہے پھر آنکھوں کے آگے عہدِ وصال آ رہا ہے پھر
عہدِ وصال کی قسم! اس کو بھلا نہ دے
او نازنیں! خدا کے لیے بد دعا نہ دے

بیتی ہوئی بہار کی راتوں کو یاد کر اُن بھولی بھالی پیار کی باتوں کو یاد کر
ماضی کا واسطہ، انھیں دل سے مٹا نہ دے
او نازنیں! خدا کے لیے بد دعا نہ دے

بدلا ہوا سا محفلِ دل کا سماں ہے پھر حسرت ہو آرزو کہ تمنا جواں ہے پھر
تو اپنی شمعِ عشق ابھی سے بجھا نہ دے
او نازنیں! خدا کے لیے بد دعا نہ دے

ڈرتا ہوں کانپتا ہوں تری بد دعا سے میں رحمت کی بھیک مانگ رہا ہوں خدا سے میں
یوں بد دعا نہ دے مجھے بہرِ خدا نہ دے
او نازنیں! خدا کے لیے بد دعا نہ دے

گجرات کی رات

آج قسمت سے نظر آئی ہے برسات کی رات
کیا بگڑ جائے گا رہ جاؤ یہیں رات کی رات

ان کی پابوسی کو جائے تو صبا کہہ دینا
آج تک یاد ہے وہ آپ کے گجرات کی رات

جس میں سلمیٰ کے تصور کے ہیں تارے روشن
میری آنکھوں میں ہے وہ عالمِ جذبات کی رات

ہائے وہ مست گھٹا، ہائے وہ سلمیٰ کی ادا
آہ! وہ دورِ حباب آہ! وہ گجرات کی رات

میرے سینے پہ اُدھر زلفِ معطر کا ہجوم
آہ! وہ زلف کہ آوارہ خرابات کی رات

سطحِ دریا پہ اُدھر نشے میں لہرائی ہوئی
رنگ لائی ہوئی چھائی ہوئی برسات کی رات

اُف وہ سوئی ہوئی، کھوئی ہوئی فطرت کی بہار
اُف وہ چھلکی ہوئی، بہکی ہوئی برسات کی رات

پھر وہ ارمانِ ہم آغوشی کا جذبِ گستاخ
آہ وہ رات وہ سلمیٰ سے ملاقات کی رات

کیوں نہ ان دونوں پہ مٹنے کی ہو حسرت اختر
اُف وہ اس رات کی بات، آہ وہ اس بات کی رات

تنہائی کی وادی میں

"رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو"

اہلِ عالم ہوں نہ ربطِ دوستی و دشمنی
مہرباں کوئی نہ ہو، نامہرباں کوئی نہ ہو

دامنِ صحرا میں چل کر یوں گزارا چاہیے
سر میں ہو بیتابِ سجدہ، آستاں کوئی نہ ہو

ابنِ آدم کے اثر تک سے ہو بیگانہ فضا
مرد و زن کوئی نہ ہو پیر و جواں کوئی نہ ہو

زخمہ زن ہو بربطِ دل پر نہ سوزِ عاشقی
کوئی دلدادہ نہ ہو اور دلستاں کوئی نہ ہو

اپنی فریادوں کی لے میں رات دن کھوئے رہیں
ہم نوا کوئی نہ ہو ہم داستاں کوئی نہ ہو

دل میں پیدا ہی نہ ہو، اوّل تو دردِ آرزو
ہو تو اس کی بیکسی کا رازداں کوئی نہ ہو

رو دیئے تو ہو نہ اپنے حال کا پرساں کوئی
اور اگر فریاد کیجے ہم زباں کوئی نہ ہو

پڑ رہئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

اختر! اس تنہائی کی وادی میں اپنے واسطے
جب بنے تربت تو تربت کا نشاں کوئی نہ ہو

فراق

حیراں ہے آنکھ جلوۂ جاناں کو کیا ہوا
ویراں ہیں خواب گیسوئے رقصاں کو کیا ہوا

قصرِ حسیں خموش ہے، ایوان پُر سکوت
آوازہائے سروِ خراماں کو کیا ہوا

پردوں سے روشنی کی کرن پھوٹتی نہیں
اس شمعِ رنگ و بو کے شبستاں کو کیا ہوا

دنیا سیاہ خانۂ غم بن رہی ہے کیوں
اللہ! امیرکرماہِ خراماں کو کیا ہوا

طوفاں اٹھا رہی ہیں مرے دل کی دھڑکنیں
اُس دستِ نرم و ساعدِ لرزاں کو کیا ہوا

نادان آنسوؤں کو ہے مدت سے جستجو
آرام گاہِ گوشۂ داماں کو کیا ہوا

سیرابی کاریِ لبِ گلگوں کدھر گئی ہیں تشنہ کام ساغر جاناں کو کیا ہوا
کشتِ مراد ہو چلی نذرِ سمومِ غم یارب نمودِ ابرِ خراماں کو کیا ہوا

روتا ہے بات بات پہ یوں زار زار کیوں
اختؔر خبر نہیں دلِ ناداں کو کیا ہوا

ساقی سے

اٹھ ساقیٔ گلفام، اٹھا پھول، اڑا پھول
بے تاب ہیں مے خوار، پلا پھول، لٹا پھول
ہاں پھول کھلا پھول

اٹھ پھول اٹھا پھول ——— لا پھول، پلا پھول

دنیا کے ستم بھول، زمانے کے الم بھول
فریاد و فغاں کس لیے سنسار کے غم بھول
غم بھول، اڑا پھول

اٹھ پھول اٹھا پھول ——— لا پھول، پلا پھول

مینا کی طرف گام بڑھا، گام بڑھا، گام
لا جام بڑھا، جام بڑھا، جام بڑھا جام
اور جام میں لا پھول

اٹھ پھول اٹھا پھول ——— لا پھول پلا پھول

دل سرد ہے، دل سرد ہے، دل سرد ہے دنیا
بیدرد ہے، بیدرد ہے، بیدرد ہے دنیا
عشرت کے کھلا پھول

اُٹھ پھول اٹھا پھول ——— لا پھول، پلا پھول!
تاروں سے مرصّع ہوئے ناب کا ساغر
ناہید کا پیمانہ ہو، مہتاب کا ساغر
ساغر میں کھلا پھول

اُٹھ پھول اٹھا پھول ——— لا پھول، پلا پھول!

عشرت رفتہ

تجھے کیوں عشرتِ رفتہ کی یاد آتی ہے رہ رہ کر
مرے نادان دل کچھ تو بتا یہ ماجرا کیا ہے؟
پُرانے قصّے دہرانے سے آخر فائدہ کیا ہے؟
بتا ماضی کی دھن کیوں اتنا تڑپاتی ہے رہ رہ کر؟

———

کسی کا حال دنیا میں کبھی یکساں نہیں رہتا
جہاں دیکھو تغیّر ہی تغیّر کی حکومت ہے
تغیّر اصل ہستی ہے، تغیّر اصلِ فطرت ہے

تغیر ہو نہ جس انساں میں وہ انساں نہیں رہتا
خزاں کے بعد آتی ہیں بہاریں باغِ عالم میں

بہاریں ختم ہونے پر خزاں کا دور آتا ہے
چمن روتا ہے اک دن دوسرے دن مسکراتا ہے
غرض عمریں گزر جاتی ہیں یوں شادی و ماتم میں

تو اپنے رنج کو راحت بنا سکتا نہیں اے دل
بلا کر عشرتِ رفتہ کو لا سکتا نہیں اے دل

پردیسی سے

بھول نہ جانا او پردیسی ‏ او پردیسی! بھول نہ جانا
پھر کبھی آنا او پردیسی ‏ او پردیسی! پھر کبھی آنا

چلتے رستے پریت لگائی
بھولے من پر آفت ڈھائی
ہوتی ہے کیا پیڑ پرائی

یہ بھی نہ جانا او پردیسی ‏ او پردیسی! یہ بھی نہ جانا
بھول نہ جانا او پردیسی ‏ او پردیسی! بھول نہ جانا

میں تو تھی الہڑ بھولی بھالی
گانو کی سادہ بہنے والی
من تھا مورکھ پریم سے خالی
من تھا مورکھ تو تھا سیانا اوپردیسی تو تھا سیانا
بھول نہ جانا او پردیسی! او پردیسی! بھول نہ جانا

شہر میں جا کر دل نہ لگانا
لوٹ کے پھر اس گانو میں آنا
گانو ہی کا ہے پریم سہانا
پریم سہانا او پردیسی! او پردیسی! پریم سہانا
بھول نہ جانا او پردیسی! او پردیسی! بھول نہ جانا
پھر بھی آنا او پردیسی! او پردیسی! پھر بھی آنا

ساون کی گھٹائیں

ساون کی گھٹائیں چھا گئی ہیں
برسات کی پریاں آگئی ہیں
دل دینے کی رت آئی ہے سینوں میں اُمنگ سمائی ہے

ارمانوں نے عید منائی ہے

امیدیں جوانی پا گئی ہیں

کہیں سنبل و گل کی بہاریں ہیں   کہیں سرو و سمن کی قطاریں ہیں

کہیں سبزے نے رنگ نکالا ہے

کہیں کلیاں چھاؤنی چھا گئی ہیں

کہیں کوئل شور مچاتی ہے   کہیں بلبل نغمے گاتی ہے

کہیں مور ملہار سناتے ہیں

گھنی بدلیاں دھوم مچا گئی ہیں

شکوۂ جدائی

اب تو آؤ پاس ہمارے

دل کے سہارے آنکھ کے تارے

بیت چلیں مہتاب کی راتیں   پیار کے میٹھے خواب کی راتیں

ہجر کے دن بھی کتنے گزارے

اب تو آؤ پاس ہمارے

کالے کوسوں چھاؤنی چھائی   دل سے ہماری یاد بھلائی

بیٹھے ہو کب سے ہم کو بسارے
اب تو آؤ پاس ہمارے

خوش ہے بلبل پھول کے غم سے اور پتنگا شمع کے دم سے
ہائے جئیں ہم کس کے سہارے
اب تو آؤ پاس ہمارے

ایک خط کی رسید

پھر وہی نکہتِ مستانہ کدھر سے آئی؟
خوشبوئے گیسوئے جانانہ کدھر سے آئی؟
سالہا سال کی محرومی و تنہائی کے بعد
یہ انیسِ دلِ دیوانہ کدھر سے آئی؟
آہ وہ نکہتِ مدہوش جو کھو دیتی تھی ہوش
پھر جلو میں لیے میخانہ، کدھر سے آئی؟
ایک دن جس سے مہکتا تھا حریم سلمیٰ
وہی خوشبو دلِ دیوانہ کدھر سے آئی؟
ایک بھولا ہوا خواب، ایک بھلائی ہوئی یاد
لے کے یہ مونسِ جانانہ کدھر سے آئی؟

اس کے پیراہنِ رنگیں میں جو بستی تھی مہک
پھر بناتی ہوئی دیوانہ، کدھر سے آئی؟

چپکے چپکے جسے سنتی تھی شبِ وصل، صبا
گنگناتی وہی افسانہ، کدھر سے آئی؟

جس کی مستی میں ہیں گم، ارض و سما تک، وہ شمیم
پھر لٹاتی ہوئی میخانہ، کدھر سے آئی؟

جس کی ہر لہر میں ہے حسنِ غزلخواں وہ نسیم
آج یوں جانبِ کاشانہ، کدھر سے آئی؟

جس کی ہر موج میں فردوس ہے رقصاں وہ ہوا
پھر لنڈھاتی ہوئی خم خانہ، کدھر سے آئی؟

جس کے قدموں پہ پری خانۂ انجم ہو نثار
وہ پری، جانِ پری خانہ، کدھر سے آئی؟

جس کو احساس کے ہونٹوں سے پیا کرتے تھے
حور، اٹھائے وہی پیمانہ، کدھر سے آئی؟

رہ گزاروں پہ ہوا کرتی تھی جس کی حسرت
گھر پہ وہ نکہتِ شاہانہ، کدھر سے آئی؟

لے کے گیسوئے سلمیٰ کا پیام رنگیں
آج یہ قاصدِ جانانہ، کدھر سے آئی؟

عزمِ رنگیں

میں خواب بن کے تیرے شبستاں میں آؤں گا

میں خواب بن کے تیرے شبستاں میں آؤں گا
چپکے سے خواب گاہ کے پردے اٹھاؤں گا
دستِ صبا کی طرح تجھے گدگداؤں گا
اور تیرے پائے ناز پہ سجدے لٹاؤں گا

میں خواب بن کے تیرے شبستاں میں آؤں گا

ہر چند راہ روکیں گے دیوار و در ترے
آنے نہ دیں گے باغ میں نخل و شجر ترے
چوموں گا دستِ نازنیں آکر مگر ترے
دُزدِ حنا کی طرح تجھے گدگداؤں گا

میں خواب بن کے تیرے شبستاں میں آؤں گا

تو میرے پاس آنے سے معذور ہی سہی
میرا فراق بھی تجھے منظور ہی سہی

یہ بھی سہی کہ مجھ سے بہت دور ہی سہی
ان دوریوں کو وصل کا عالم بناؤں گا
میں خواب بن کے تیرے شبستاں میں آؤں گا

تو محوِ خواب ہوگی شبستانِ ناز میں
آسودہ، اپنی خلوتِ رنگیں طراز میں
منہ کو چھپائے سایۂ زلفِ دراز میں
سایہ سا بن کے میں بھی نظر میں سماؤں گا
میں خواب بن کے تیرے شبستاں میں آؤں گا

تسلیم ہے بہت سے خلل ہوں گے راہ میں
بے شک تباہیوں کے محل ہوں گے راہ میں
دریا و کوہ و دشت و جبل ہوں گے راہ میں
دریا و کوہ و دشت کو نیچا دکھاؤں گا
میں خواب بن کے تیرے شبستاں میں آؤں گا

بے خواب ہوگی گر تو شبِ مشکبار میں
کھوئی ہوئی ترانۂ ابرِ بہار میں
میں آبسوں گا دیدۂ افسانہ کار میں
اور اک فسانہ تجھ کو سُنا کر، سُلاؤں گا
میں خواب بن کے تیرے شبستاں میں آؤں گا

قرباں کروں گا تجھ پہ گلِ نو بہار میں
لعل و گہر منگاؤں گا، بہرِ نثار میں
پہناؤں گا گلے میں، ستاروں کے ہار میں
بستر پہ تیرے خلد کی کلیاں بچھاؤں گا
میں خواب بن کے تیرے شبستاں میں آؤں گا

دیکھے گی خواب میں تو نظارے بہار کے
نظروں میں جگمگائیں گے تارے بہار کے
رقصاں لبوں پہ ہوں گے شرارے بہار کے
اور میں ترے لبوں سے شرارے چراؤں گا
میں خواب بن کے تیرے شبستاں میں آؤں گا

بہار کی تاروں بھری رات

سرِ وادیِ ماہ، شامِ بہار
پروتی ہے تاروں کے زرّین ہار
فضاؤں میں شمعیں فروزاں ہوئیں
کہ زرپوش پریاں نمایاں ہوئیں
یہ معصوم تارے ہیں نکھرے ہوئے
کہ گلہائے زریں ہیں بکھرے ہوئے
یہ تارے ہیں یا حسرتوں کے چراغ
امیدوں کے پھول آرزو کے ایاغ
سرِ نیل اُبھرے طلائی حُباب
کہ زہرہ جبینوں کے رنگین خواب

یہ آنسو ہیں حورانِ معصوم کے
کہ ارماں ہیں دلہائے مغموم کے
ہیں سیمیں سفینے پرستان کے
کہ شفّاف موتی ہیں عمّان کے
بہشتوں کی شبنم کے آنسو ہیں یہ
کہ فردوسِ رنگیں کے جگنو ہیں یہ
اُفق نُور سے جگمگانے لگا
فلک روشنی میں نہانے لگا
فضا میں نمایاں گلستاں ہوا
سرِ چرخ کیسا چراغاں ہوا
نسیمِ چمن گنگنانے لگی
فضا وجد میں تھرتھرانے لگی
ہواؤں میں رقصاں ہوئے میکدے
چمن میں غزلخواں ہوئے میکدے

درختوں کے پہلو میں حُورِ بہار
بجاتی ہے شاخوں کے رنگیں ستار

ایک عزیزہ کی شادی پر

نویدِ رحمتِ پروردگار بن کے رہو
برنگِ سایۂ نخلِ چنار بن کے رہو
تم اپنے گھر کے چمن میں بہار بن کے رہو
بہشتِ نو کی فضائیں تمھیں مبارک ہوں
مسرتوں کی گھٹائیں تمہیں مبارک ہوں
نسیمِ گل کی طرح مشکبار بن کے رہو
زمانے بھر کی خوشی ہو تمہاری قسمت میں
ہمیشہ عمر گزارو سوادِ راحت میں
تبسّمِ چمنِ روزگار بن کے رہو

مثالِ شمع، تم اس تازہ انجمن میں رہو | برنگِ غنچہ و گل، شاد اس چمن میں رہو
تمہارا گھر ہو چمن، تم بہار بن کے رہو

نئے عزیز ہوں مسرور و شادماں تم سے | نظر فروز بنے بزم خانداں تم سے
فروغِ دیدۂ لیل و نہار بن کے رہو

نشانے پائیں نہ افکار اس جہاں کے تمہیں | کریں ملول نہ آزار آسماں کے تمہیں
نزولِ سایۂ پروردگار بن کے رہو

سرورِ دیدۂ ملت کہے تمہیں دنیا | غرورِ عصمت و عفت کہے تمہیں دنیا
جہاں میں عصمت و عفت مدار بن کے رہو

سعادتیں ہوں میسر جہانِ نو میں تمہیں | نصیب برکتیں ہوں گلستانِ نو میں تمہیں
برنگِ دامنِ ابرِ بہار بن کے رہو

تمہاری خوبیٔ قسمت کی انتہا نہ کچھ | عروج و عظمت و دولت کی انتہا نہ کچھ
حریفِ سطحِ یمِ بے کنار بن کے رہو

بہارِ چشمِ زمانہ بنو زمانے میں | مسرتوں کا خزانہ بنو زمانے میں
طراوتِ گہرِ آبدار بن کے رہو

مثالِ طایرِ پر و بیں ہو جہاں بھی رہو | برنگِ غنچۂ نسریں ہو جہاں بھی رہو
حریفِ خندۂ فصلِ بہار بن کے رہو

دعا ہے سب کی کہ آزاد با مراد رہو | دلوں کو شاد رکھو خود ہمیشہ شاد رہو
قرارِ جان و دلِ بے قرار بن کے رہو

صحنک

جلوۂ قدس، سرِ بزم حسیں طاری ہے
چار سُو بال فشاں عصمت و عفّت کی مہک
جس پہ ہوتی ہے فدا وادیِ جنّت کی مہک
کہکشاں، محوِ ضیا باری و گل باری ہے

○

آہ! یہ رات، یہ موسم، یہ ستاروں کی بہار
جمع ہیں ایک طرف چند خواتین حسین
گلشنِ عفت و حرمت کی ریاحینِ حسین
وہ ریاحیں کہ جنھیں کہیے بہاروں کی بہار

○

پھیلی ہے چار طرف نکہتِ گلہائے نیاز
پارسائی کی بہاروں کا سماں چھایا ہے
وہ سماں جس کا کہ فردوسِ بریں سایہ ہے
ہائے یہ جلوۂ معصوم یہ سیمائے نیاز
امتحاں اپنے تقدّس کا ہے مقصود ان کا
وہ تقدّس کہ دل و جاں سے ہی مسجود ان کا

دیکھ اے کنول کے پھول

دیکھ اے کنول کے پھول مرے نورِ دیدہ کو　　میرے بہشتِ دل کے گلِ نو رسیدہ کو
اس پیکرِ بہار کو دیکھ اے کنول کے پھول! دیکھ اے کنول کے پھول

دیکھ اے کنول کے پھول مرے مہ جمال کو　　میرے ریاضِ عمر کے رنگیں نہال کو
اس پیکرِ بہار کو دیکھ اے کنول کے پھول! دیکھ اے کنول کے پھول

تجھ میں یہ رنگِ حسن کی گلکاریاں کہاں　　جو اس میں ہیں وہ تجھ میں سمن باریاں کہاں
ہاں! میرے گلعذار کو دیکھ اے کنول کے پھول! دیکھ اے کنول کے پھول

معصومیت کے عرش کا یہ اک فرشتہ ہے　　سرتاپا جمالِ محبت سرشتہ ہے
اس ماہِ در کنار کو دیکھ اے کنول کے پھول! دیکھ اے کنول کے پھول

شامِ بہارِ حسن کا روشن ستارہ ہے　　باغِ امید کا گلِ رنگیں نظارہ ہے
اس حسنِ پر بہار کو دیکھ اے کنول کے پھول! دیکھ اے کنول کے پھول

اے پھول تجھ میں اس کی سی بو باس ہے کہاں؟　　بتلا تو ایسا تاج ترے پاس ہے کہاں؟
اس ننھے تاجدار کو دیکھ اے کنول کے پھول! دیکھ اے کنول کے پھول

تیری طرح کھلے گا چمن زارِ دہر میں　　پھولے پھلے گا گلشنِ اسرارِ دہر میں
اس نکہتِ بہار کو دیکھ اے کنول کے پھول! دیکھ اے کنول کے پھول

بیوی کا شوہر کے نام پہلا خط

لیلائے رازِ شوق کا محمل ہے ہات میں
یعنی بجائے خامہ مرا دل ہے ہات میں

احوالِ دل لکھوں، خلشِ مدعا لکھوں؟
رکتی ہوں لفظ لفظ پہ آخر میں کیا لکھوں؟

دل اپنی دھڑکنوں کو چھپائے کس طرح
پہلے پہل کا خط ہے لکھا جائے کس طرح

لکھنے کو تو میں لکھتی ہوں تم کو ہزار خط
لکھ لکھ کے پھاڑ دیتی ہوں پہ بار بار خط

گستاخی کا خیال گر آئے تو کیا کروں؟
دل شرم سے جو ہات دبائے تو کیا کروں؟

خط کے خیال نے مجھے تم سے ملا دیا
اور میری بے خودی پہ قلم مسکرا دیا

پہلے پہل کی مشق کو مجبور جانیے
بے ربطیٔ خیال کو معذور جانیے

مجھ سے بیانِ شوق کو ظاہر کیا بھی جائے
لکھنے کا حوصلہ ہے مگر کچھ لکھا بھی جائے
کیا میری بے خودی کا پتہ پا گیا ہے کچھ ؟
کاغذ سے جھک کے میرے قلم نے کہا ہے کچھ
کر جائے گا خفا کہ ہنسا جائے گا یہ خط
اللہ! کس نظر سے پڑھا جائے گا یہ خط
پہلے پہل کے خط میں، میں کیا ماجرا لکھوں
کہہ دو "یہ کیا لکھا ہے" میں کہتی ہوں "کیا لکھوں"
طاری جو اک ہجومِ خیالات دل پہ ہے
اک ہات میں قلم ہے تو اک ہات دل پہ ہے

عورت

حیا و حرمت و مہر و وفا کی شان ہے عورت
شباب و حسن و انداز و ادا کی جان ہے عورت
حجاب و عصمت و شرم و حیا کی کان ہے عورت
جو دیکھو غور سے ہر مرد کا ایمان ہے عورت

اگر عورت نہ آتی کل جہاں ماتم کدہ ہوتا
اگر عورت نہ ہوتی ہر مکاں اک غم کدہ ہوتا

جہاں میں ایک سچّے مرد کی تقدیر ہے عورت
طلسمِ عالمِ بالا کی اک اکسیر ہے عورت

یدِ قدرت میں اک چلتی ہوئی شمشیر ہے عورت
زمیں پر فطرتِ معصوم کی تصویر ہے عورت

جہاں میں کرتی ہے شاہی مگر لشکر نہیں رکھتی
دلوں کو کرتی ہے زخمی مگر خنجر نہیں رکھتی

کہیں معصوم طفلی اس کے نغموں سے بہلتی ہے
کہیں بے خود جوانی اس کے نوشِ لب سے کھیلتی ہے

کہیں مجبور پیری اس کی باتوں سے سنبھلتی ہے
کہیں آرام سے جاں اس کے قدموں پر نکلتی ہے

نہیں ہے کبریا لیکن یہ شانِ کبریائی ہے
ہماری ساری پیاری عمر پر اس کی خدائی ہے

اُسی کی بُو ہے دنیا کے لہکتے غنچہ زاروں میں
اُسی کا رنگ گلشن کی مہکتی نوبہاروں میں

اُسی کے نغمے جنّت کے مچلتے آبشاروں میں
اُسی کا نور، قدرت کے بہاریں جلوہ زاروں میں
بہارِ آفرینش ہے شبابِ زندگانی ہے
جواں فطرت کا اک کھویا ہوا خوابِ جوانی ہے
وہ روتی ہے تو ساری کائنات آنسو بہاتی ہے
وہ ہنستی ہے تو فطرت، بے خودی سے مسکراتی ہے
وہ سوتی ہے تو ساتوں آسماں کو نیند آتی ہے
وہ اٹھتی ہے تو کل خوابیدہ دُنیا کو اٹھاتی ہے
وہی ارمانِ ہستی ہے، وہی ایمانِ ہستی ہے
بدن کہیے اگر ہستی کو تو وہ جانِ ہستی ہے
وہ چاہے تو الٹ دے پردۂ دنیائے فانی کو
وہ چاہے تو مٹا دے جوششِ بحرِ زندگانی کو
وہ چاہے تو جلا دے نخلِ زارِ حکمرانی کو
وہ چاہے تو بدل دے رنگ بزمِ آسمانی کو
وہ کہہ دے تو بہارِ جلوہ مٹ جائے نظاروں سے
وہ کہہ دے تو لباسِ نور چھن جائے ستاروں سے

حوصلے

تودۂ خاک تھی یکسر تری دنیائے حیات
خونِ دل سے، اسے گلزار بنایا میں نے
اپنے افکارِ جمالی سے بسایا میں نے

روشِ خلد کا محرم نہ تھا صحرائے حیات
زینتِ ذوق سے بیگانہ تھی لیلائے حیات
نکہت و رنگ کا انداز بتایا میں نے
نغمہ و حُسن کا اعجاز سکھایا میں نے

رشکِ صد طور و ارم بن گیا سینائے حیات
تیری دنیا تھی محبّت سے سراسر محروم
میں نے یہ دردِ حسیں آکے سکھایا اس کو
کیفِ صہبائے غمِ روح بتایا اس کو

ورنہ یہ خاک تھی لذّت سے سراسر محروم
آخری پردہ بھی اک روز اٹھا ہی دوں گا
تیری صورت بھی زمانے کو دکھا ہی دوں گا

خمارِ شبانہ

فصلِ گُل دیکھ چکے، دورِ خزاں دیکھ چکے
ہم تماشائے گلستانِ جہاں دیکھ چکے
سایۂ زلفِ حسیناں میں گزاریں راتیں
سنبلستاں میں خوابوں کا سماں دیکھ چکے
چاندنی رات میں خوشبو سے نہائے اکثر
کرمِ پیرہنِ گلبدناں دیکھ چکے
کی ہے مے نوشئ لعلِ لبِ گلفام بہت
التفاتِ لبِ شیریں دہناں دیکھ چکے
مشکبو زلفوں سے کھیلے ہیں بہت راتوں کو
جرأت آموزیِ نسریں بدناں دیکھ چکے
ہم نے راتوں کو بہت، محلوں پہ پھینکے پتھر
اثرِ برہمیِ زلفِ بتاں دیکھ چکے
دن کو تارے سے چمکتے نظر آئے سرِ بام
اکثر آنکھیں سرِ بام اشک فشاں دیکھ چکے

دل میں جینے کی تمنا نہیں باقی اختر
خوب جی بھر کے تماشائے جہاں دیکھ چکے

ایک تنہا مرغابی

اُفق کو نغمۂ غمگیں سے کیوں تڑپا رہی ہے تو؟
سکوتِ شب میں فریادیں سی کیوں برسا رہی ہے تو؟
بتا تو اس طرح تنہا، کہاں سے آ رہی ہے تو؟

کہاں بچھڑا ہے تجھ سے آہ ننھا کارواں تیرا؟
ہے کیوں ایک ایک نغمہ اس طرح ماتم چکاں تیرا؟
ہوا میں ایک آنسو بن کے کیوں لہرا رہی ہے تو؟

تری ہمجولیاں رخصت ہوئیں آخر کہاں تجھ سے؟
خفا کیوں ہو گیا اس طرح ظالم آسماں تجھ سے؟
فضا میں کس لیے آہ و فغاں برسا رہی ہے تو؟

ترے ناشاد نغمے سُن کے غمگیں ہیں ستارے بھی
ہوا ساکت، فضا صامت، فسردہ ہیں نظارے بھی
اُداسی ہی اُداسی، ہر طرف پھیلا رہی ہے تو

کہاں پائے گی اب تو اُن مچلتی جوئباروں کو؟
خزاں میں آئی ہے روتی ہوئی پچھلی بہاروں کو؟
تلاش و جستجو بے سود ہے کیوں جا رہی ہے تو؟

گئے وہ دن کہ برکھا کی ہوا تھی تیرا گہوارہ
نشیمن تھا ترا دریا، گھٹا تھی تیرا گہوارہ
اب اُن کی یاد میں کیوں نغمۂ غم گا رہی ہے تو؟

ترے ہم جنسوں کی اکثر صدائیں سُن چکا ہوں میں
شبِ مہتاب میں رنگیں نوائیں سُن چکا ہوں میں
مگر یہ اور ہی کچھ لَے ہے جس میں گا رہی ہے تو

تو فریادِ غریباں ہے کہ نالہ دردمندوں کا؟
فغانِ عاشقانہ ہے کہ شیون غم پسندوں کا؟
فضا کے دل کو بھی احساس سے تڑپا رہی ہے تو

ترا سینہ گدازِ عشق کا گہوارہ ہے، کیا ہے؟
تو سازِ درد کا اک نغمۂ آوارہ ہے، کیا ہے؟
افق پہ نالۂ غم کی طرح کیوں چھا رہی ہے تو؟

کسی غمگین دل کی ہے دعائے راہ گم کردہ؟
کہ اک فرقت زدہ کی التجائے راہ گم کردہ؟
کہاں سے آئی کس جانب بھٹکتی جا رہی ہے تو؟

ترے ہمراہیوں کی بے وفائی کا مجھے غم ہے
میں سمجھا تھا یہ شیوہ قسمتِ اولادِ آدم ہے
جبھی اس چاندنی میں مجھ کو غمگیں پا رہی ہے تو

شریکِ رنج و غم کوئی نہیں دنیا کی محفل میں
بہت ڈھونڈی نہ پائی میں نے دلسوزی کسی دل میں
احبا کے تصور سے مجھے تڑپا رہی ہے تو

جسے دیکھا جہاں میں خود غرض اور بیوفا دیکھا
ذلیل و پست فطرت اور مطلب آشنا دیکھا
دلا کر یاد اُن کی، آگ سی بھڑکا رہی ہے تو

روگ کا راگ

انھیں جی سے میں کیسے بھلاؤں سکھی مرے جی کو آ کے لُبھا ہی گئے
مرے من میں درد بسا ہی گئے، مجھے پریت کا روگ لگا ہی گئے
کیئے میں نے ہزار جتن، کہ بچا رہے پریت کی آگ سے من
مرے من میں اُبھار کے اپنی لگن، وہ لگاوٴ کی آگ لگا ہی گئے
بڑے سکھ سے یہ بیتتے تھے چودہ برس کبھی میں نے پیا نہ تھا پریم کا رس
مری آنکھوں کو شیام دکھا کے درس مرے ہردے میں چاہ بسا ہی گئے

کبھی سپنوں کی چھاؤں میں سوئی نہ تھی، کبھی بھول کے دکھ سے میں روئی نہ تھی
مجھے پریم کے سپنے دکھا ہی گئے، مجھے پریت کے دکھ سے رلا ہی گئے
رہے رات کی رات سدھار گئے، مجھے سپنا سمجھ کے بار گئے
میں تھی ہار، گلے سے اتار گئے، میں دیا تھی جسے وہ بجھا ہی گئے
سکھی کوئلیں ساونی گائیں گی پھر، نئی کلیاں بھی چھاؤنی چھائیں گی پھر
مرے چین کی راتیں نہ آئیں گی پھر، جنھیں نین کے نیر مٹا ہی گئے
مرے جی میں تھی بات چھپائے رکھوں، سکھی چاہ کو من میں دبائے رکھوں
انھیں دیکھ کے آنسو جو آ ہی گئے، مری چاہ کا بھید وہ پا ہی گئے

زندگی

زندگی مست ہے اس طائرِ ناداں کی طرح
جو ہو تنہا نگراں دور فضاؤں کی طرف
محوِ خورشید کی زرکار ضیاؤں کی طرف
محوِ نظارہ کبھی نرگسِ حیراں کی طرح
اور کبھی بال فشاں بوئے خیاباں کی طرح
مسکراتی ہوئی شاداب گھٹاؤں کی طرف
وادیٔ کوہ کی مستانہ ہواؤں کی طرف

نگہتِ گل کدہ وسیلِ بیاباں کی طرح
آرزو اڑنے کی کرتی رہے بے تاب سدا
پر نظر آئے نہ تسکین کا انداز اس کو
یونہی ترساتی رہے حسرتِ پرواز اس کو
نارسائی کی خلش سے رہے بیخواب سدا
کبھی آرام نہ دے حسرتِ پرواز جسے
اپنا انجام نظر آئے نہ آغاز جسے

میری داستانِ حیات

ستاروں کی کہانی کہیے، خوابوں کا بیاں لکھیے
وہ کہتی ہیں کہ اپنی زندگی کی داستاں لکھیے
ہماری زندگی نیرنگیِ عالم کا منظر ہے
کبھی آرامِ دل کہیے، کبھی آزارِ جاں لکھیے
چمن میں برگِ گل پر قطرۂ شبنم جو لرزاں ہے
اسے پیشِ نظر رکھیے، ہماری داستاں لکھیے
کبھی ہر سانس کو اک نکہتِ آبِ بقا کہیے
کبھی ہر لمحے کو پیغامِ مرگِ ناگہاں لکھیے

کبھی خوابِ زلیخا کہیئے ہر شب کے نظاروں کو
کبھی افسانۂ یوسف بدستِ کارواں لکھیے
کبھی پھولوں کی سیجوں کو ہمارا دردِ سر کہیے
کبھی جنگل کے کانٹوں کو ہمارا آشیاں لکھیے
کبھی ہر لمحۂ غم کو خلاصہ کہیے دوزخ کا
کبھی ہر فرصتِ رنگیں کو عمرِ جاوداں لکھیے
کبھی بیگانگیِ دیر و کعبہ کا بیاں کیجے
کبھی افسانۂ رسوائیِ کوئے بتاں لکھیے
کبھی شادابیِ گلہائے نو کا تذکرہ کیجے
کبھی افسانۂ بربادیِ برگِ خزاں لکھیے
کبھی پریوں کے سینوں کو ہمارا رازداں کہیے
کبھی حوروں کے ہونٹوں کو ہمارا ہم زباں لکھیے
کبھی سلمٰی کے رومانِ حسیں کے تذکرے کیجے
کبھی عذرا کے افسانے کو عشقِ رائیگاں لکھیے
کبھی نسرین کی الفت کو گلے کا ہار کہہ دیجے
کبھی ریحانہ کی بد و نیتوں کو حرزِ جاں لکھیے

کبھی پروین کی مرگِ عاشقی پر فاتحہ پڑھیے
کبھی شمشہ کے زہر آلود ہونٹوں کا بیاں لکھیے
کبھی حُسنِ ثریا کو ہمارا آئینہ کہیے
کبھی ناہید کے دل کو ہمارا آشیاں لکھیے
کبھی شیریں کے مستانہ تبسّم کا بیاں کیجیے
کبھی لیلیٰ کے خونیں آنسوؤں کی داستاں لکھیے
کبھی دہرائیے قصّہ جہانگیر ابنِ اکبر کا
کبھی اپنے اودھ کے جانِ عالم کا بیاں لکھیے
کبھی غالب کو اور مومن کو کہیے ہم صفیر اپنا
کبھی خیّام و حافظ کو ہمارا ہم زباں لکھیے
الف سے ی تلک، القصّہ جو بھی نام دلکش ہو
ہر اک سے بدگماں ہو کر، ہر اک کی داستاں لکھیے
کبھی فرطِ غم و آلام کو مُہرِ زباں کہیے
کبھی افکارِ شعر و عشق کو جوئے رواں لکھیے
کبھی ہر بے دلی کو غم کا اک تحت الثریٰ کہیے
کبھی ہر آرزو کو ایک خوابِ کہکشاں لکھیے

کبھی ہر صبح کو دردِ خمارِ ناگہاں کہیے
کبھی ہر شب کو طوفانِ نشاطِ نوجواں لکھیے

کبھی جنت کی حوروں کو گدائے در سمجھ لیجے
کبھی مفلس گداؤں کو ہمارا ہم زباں لکھیے

غرض اختر کی ساری زندگی کا یہ خلاصہ ہے
کہ پھولوں کی کہانی کہیے شعلوں کا بیاں لکھیے

شاعر کی تربت

دامانِ خرابہ زار میں ہے	اک شاعرِ نوجواں کی تُربت
یا وادیِ نو بہار میں ہے	اک نکہتِ رائیگاں کی تربت

○

آتیں نہیں اس طرف ہوائیں	شاداب و شگفتہ پھول لے کر
زائر نہیں اشک جو بہائیں	سینے میں دلِ ملول لے کر

○

ممنونِ بہار کی نہیں ہے	کھلتے نہیں پھول اس زمیں سے
بیکس کا یہ مرقدِ حزیں ہے	بیگانہ گلاب و یاسمیں سے

○

پر چشمِ بصیرت آشنا کو | مل جائے جو رخصتِ تماشا
اور غور سے گورِ باصفا کو | دیکھے تو ہے عبرتِ تماشا

○

شاعر کے الم گسار ہیں جمع | تربت پہ ہجوم ہو رہا ہے
شمع و دلِ داغدار ہیں جمع | اور جام بھی خون رو رہا ہے

○

وہ شمع کہ جس کی روشنی میں | راتوں کو وہ فکرِ شعر کرتا
وہ جام کہ جس کو زندگی میں | وہ بادۂ شعلہ گوں سے بھرتا

○

وہ دل کہ جو تھا اسیرِ الفت | اور آج بھی خوگرِ وفا ہے
پیوست ہے جس میں تیرِ الفت | جو پھول کی طرح جانفزا ہے

○

اک سمت فضا پہ چھا رہا ہے | آئینۂ رونمائے سلمیٰ
یا موت کو گدگدا رہا ہے | نظّارۂ جانفزائے سلمیٰ

○

شاعر کو مگر نہیں خبر کچھ | وہ تیرہ نصیب سو رہا ہے
اس پر نہیں حال کا اثر کچھ | جاگا تھا غریب سو رہا ہے

مرنے کے بعد

چمن زار شاداب و خنداں رہیں گے　　درختوں پہ طائر غزلخواں رہیں گے
فضاؤں میں بادل پرافشاں رہیں گے
مگر ہم تہِ خاک پنہاں رہیں گے

گھٹائیں گلستاں پہ چھایا کریں گی　　فضائیں یونہی لہلہایا کریں گی
درختوں کے دامن گل افشاں رہیں گے
مگر ہم تہِ خاک پنہاں رہیں گے

چمن کی فضائیں مہکتی رہیں گی　　صبا کے اثر سے لہکتی رہیں گی
گل و غنچہ و برگ، رقصاں رہیں گے
مگر ہم تہِ خاک پنہاں رہیں گے

یہ شہر اور دیہات بستے رہیں گے　　صداؤں سے معمور رستے رہیں گے
بپا زندگانی کے طوفاں رہیں گے
مگر ہم تہِ خاک پنہاں رہیں گے

گھٹائیں یونہی گھر کے آیا کریں گی　　یونہی بلبلیں گیت گایا کریں گی
یونہی گلستاں، گل بداماں رہیں گے
مگر ہم تہِ خاک پنہاں رہیں گے

عروسِ سحر، روز آیا کرے گی فضا نور سے جگمگایا کرے گی
مناظر، سحر خیز و خنداں رہیں گے
مگر ہم تہِ خاک پنہاں رہیں گے
یہ راتیں یونہی جھلملایا کریں گی ستاروں کی شمعیں جلایا کریں گی
سرِ چرخ روشن، چراغاں رہیں گے
مگر ہم تہِ خاک پنہاں رہیں گے

غزلیں

○

دل میں خیالِ نرگسِ جانانہ آگیا
پھولوں سے کھیلتا ہوا دیوانہ آگیا

بادل کے اٹھتے ہی مے و پیمانہ آگیا
بجلی کے ساتھ ساتھ پری خانہ آگیا

مستوں نے اس ادا سے کیا رقصِ نغمہ بہا
پیمانہ کیا کہ وجد میں مے خانہ آگیا

اُس چشمِ مے فروش کی تاثیر کیا کہوں
ہونٹوں تک آج آپ ہی پیمانہ آگیا

معلوم کس کو قیس کی دیوانگی کی شان
ہنگامہ سا بپا ہے کہ دیوانہ آگیا

اختر، غضب تھی عہدِ جوانی کی داستاں
آنکھوں کے آگے ایک پری خانہ آگیا

○

دلِ مہجور کو تسکین کا ساماں نہ ملا
شہرِ جاناں میں ہمیں مسکنِ جاناں نہ ملا

کوچہ گردی میں کٹیں شوق کی کتنی راتیں
پھر بھی اُس شمعِ تمنا کا شبستاں نہ ملا

پوچھتے منزلِ سلمیٰ کی خبر ہم جس سے
وادیِ نجد میں ایسا کوئی انساں نہ ملا

یوں تو ہر راہ گزر پہ تھے ستارے رقصاں
جس کی حسرت تھی مگر وہ مہِ تاباں نہ ملا

لالہ و گل تھے بہت عام چمن میں لیکن
ڈھونڈتے تھے جسے وہ سروِ خراماں نہ ملا

جس کے پردوں سے مچلتی ہوئی نکہتِ شوق
بے خودی کی قسم ایسا کوئی ایواں نہ ملا

بختِ بیدار کہاں، جلوۂ دلدار کہاں
خواب میں بھی ہمیں وہ غنچۂ خنداں نہ ملا

بیکسی، تشنہ لبی، دردِ حلاوت طلبی
چاندنی رات میں بھی چشمۂ حیواں نہ ملا

یوں تو ہر در پہ لہکتے نظر آئے دامن
کھینچتے ناز سے جس کو وہی داماں نہ ملا

کس کے در پر نہ کیے سجدے نگاہوں نے مگر
ہائے تقدیر وہ غارتِ گرِ ایماں نہ ملا

کون سے بام کو رہ رہ کے نہ دیکھا لیکن
نگہِ شوق کو وہ ماہِ خراماں نہ ملا

درِ جاناں پہ فدا کرتے دل و جاں اخترؔ
وائے بر حالِ دل و جاں، درِ جاناں نہ ملا

○

وعدہ اُس ماہرو کے آنے کا
یہ نصیبہ، سیاہ خانے کا

کہہ رہی ہے نگاہِ دزدیدہ
رُخ بدلنے کو ہے زمانے کا

ذرّے ذرّے میں بے حجاب ہیں وہ
جن کو دعویٰ ہے منہ چھپانے کا

حاصلِ عمر ہے شباب، مگر
اک یہی وقت ہے گنوانے کا

چاندنی، خامشی اور آخرِ شب
آ! کہ ہے وقت دل لگانے کا

ہے قیامت ترے شباب کا رنگ
رنگ بدلے گا پھر زمانے کا

تیری آنکھوں کی ہو نہ ہو تقصیر
نام رُسوا شراب خانے کا

رہ گئے بن کے ہم سراپا غم — یہ نتیجہ ہے دل لگانے کا
جس کا ہر لفظ ہے سراپا غم — میں ہوں عنوان اُس فسانے کا
اُس کی بدلی ہوئی نظر، تو یہ — یوں بدلتا ہے رُخ زمانے کا
دیکھتے ہیں ہمیں وہ چھپ چھپ کر — پردہ رہ جائے، منہ چھپانے کا
کر دیا خوگرِ ستم اختر
ہم پہ احسان ہے زمانے کا

○

دلِ شکستہ حریفِ شباب ہو نہ سکا — یہ جام ظرف نوازِ شراب ہو نہ سکا
کچھ ایسے رحم کے قابل تھے ابتدا ہی سے ہم — کہ اُن سے بھی ستمِ بے حساب ہو نہ سکا
نظر نہ آیا کبھی شب کو اُن کا جلوۂ رُخ — یہ آفتاب کبھی ماہتاب ہو نہ سکا
نگاہِ فیض سے محروم، بر تری معلوم — ستارہ چمکا مگر آفتاب ہو نہ سکا
ہے جام خالی تو پھیکی ہے چاندنی کیسی — یہ سیلِ نور ستم ہے شراب ہو نہ سکا
یہ مے چھلک کے بھی اُس حُسن کو پہنچ نہ سکی — یہ پھول کھل کے بھی اُس کا شباب ہو نہ سکا
کسی کی شوخ نوائی کا ہوش تھا کس کو — میں ناتواں تو حریفِ خطاب ہو نہ سکا
ہوں تیرے وصل سے مایوس اس قدر گویا — کبھی جہاں میں کوئی کامیاب ہو نہ سکا
وہ پوچھتے ہیں ترے دل کی آرزو کیا ہے — یہ خواب ہائے کبھی میرا خواب ہو نہ سکا
تلاشِ معنیِ ہستی ہیں فلسفہ نہ خرد — یہ راز آج تلک بے حجاب ہو نہ سکا

شرابِ عشق میں ایسی کشش سی تھی اختؔر
کہ لاکھ ضبط کیا اجتناب ہو نہ سکا

○

آرزوئے وصل کی رکھتی ہے پریشاں کیا کیا
کیا بتاؤں کہ مرے دل میں ہیں ارماں کیا کیا

غم عزیزوں کا، حسینوں کی جُدائی دیکھی
دیکھیں، دکھلائے ابھی گردشِ دوراں کیا کیا

اُن کی خوشبو ہے فضاؤں میں پریشاں ہر سُو
ناز کرتی ہے ہوائے چمنستاں کیا کیا

دشتِ غربت میں رُلاتے ہیں ہمیں یاد آکر
اے وطن تیرے گل و سنبل و ریحاں کیا کیا

اب وہ باتیں نہ وہ راتیں نہ ملاقاتیں ہیں
محفلیں، خواب کی صورت ہوئیں ویراں کیا کیا

ہے بہارِ گل و لالہ، مرے اشکوں کی نمود
میری آنکھوں نے کھلائے ہیں گلستاں کیا کیا

ہے کرم اُن کے ستم کا کہ کرم بھی ہے ستم
شکوے سُن سُن کے وہ ہوتے ہیں پشیماں کیا کیا

گیسو بکھرے ہیں مرے دوش پہ کیسے کیسے

میری آنکھوں میں ہیں آبادِ شبستاں کیا کیا

وقتِ امداد ہے اے ہمتِ گستاخیٔ شوق

شوق انگیز ہیں ان کے لبِ خنداں کیا کیا

سیرِ گل بھی ہے ہمیں باعثِ وحشت اختؔر

ان کی الفت میں ہوئے چاک گریباں کیا کیا

○

کچھ تو تنہائی کی راتوں میں سہارا ہوتا

تم نہ ہوتے نہ سہی، ذکر تمہارا ہوتا

ترکِ دنیا کا یہ دعویٰ ہے فضول اے زاہد

بارِ ہستی تو ذرا سر سے اتارا ہوتا

وہ اگر آ نہ سکے موت ہی آئی ہوتی

ہجر میں کوئی تو غمخوار ہمارا ہوتا

زندگی کتنی مسرت سے گزرتی یارب

عیش کی طرح اگر غم بھی گوارا ہوتا

عظمتِ گریہ کو کوتاہ نظر کیا سمجھیں؟

اشک اگر اشک نہ ہوتا تو ستارا ہوتا

لبِ زاہد پہ ہے افسانۂ حورِ جنت
کاش اس وقت مرا انجمن آرا ہوتا

غمِ اُلفت جو نہ ملتا، غمِ ہستی ملتا
کسی صورت تو زمانے میں گزارا ہوتا

کس کو فرصت تھی زمانے کے ستم سہنے کی
گر نہ اس شوخ کی آنکھوں کا اشارا ہوتا

کوئی ہمدرد زمانے میں نہ پایا اخترؔ
دل کو حسرت ہی رہی کوئی ہمارا ہوتا

○

گلزارِ جہاں میں گُل کی طرح گو شاد ہیں ہم شاداب ہیں ہم
کہتی ہے یہ ہنس کر صبحِ خزاں، سب نازِ عبث اک خواب ہیں ہم

کس ماہ لقا کے عشق میں یوں بے چین ہیں ہم بے تاب ہیں ہم
کرنوں کی طرح آوارہ ہیں ہم، تاروں کی طرح بے خواب ہیں ہم

مٹ جانے پہ بھی مسرور ہیں ہم، مرجھانے پہ بھی شاداب ہیں ہم
شبہائے شباب و عشق کا اک بھولا ہوا رنگیں خواب ہیں ہم

فطرت کے جمالِ رنگیں سے، ہم نے ہی اٹھائے ہیں پردے
بربط ہے اگر فردوسِ جہاں تو اس کے لیے مضراب ہیں ہم

خوش وقتی ہے وجہِ رنج و الم گلزارِ جہاں میں اے ہمدم

طائر نہ پکاریں شاد ہیں ہم، غنچے نہ کہیں شاداب ہیں ہم

ملنے پہ گر آئیں کوئی مکاں خالی نہیں اپنے جلووں سے

اور گوشہ نشیں ہو جائیں اگر کمیاب نہیں نایاب ہیں ہم

دو دن کے لیے ہم آئے ہیں، اک شب کی جوانی لائے ہیں

فردوس سرائے ہستی میں ہم رنگِ گلِ مہتاب ہیں ہم

رسوائیِ شعر و عشق نے وہ رتبہ ہمیں اختر بخشا ہے

فخرِ دکن و بنگال ہیں ہم، نازِ اودھ و پنجاب ہیں ہم

○

حزیں ہے، بیکس و رنجور ہے دل — محبت پر مگر مجبور ہے دل

تمہارے نور سے معمور ہے دل — عجب کیا ہے کہ رشکِ طور ہے دل

تمہارے عشق سے مسرور ہے دل — ابھی تک درد سے معمور ہے دل

یہ کس کی مست آنکھیں یاد آئیں — کہ اتنا مست ہے مخمور ہے دل

کیا ہے یاد اُس یادِ جہاں نے — الٰہی کس قدر مسرور ہے دل

بہت چاہا نہ جائیں تیرے در پہ — مگر کیا کیجئے مجبور ہے دل

فقیری میں اسے حاصل ہے شاہی — تمہارے عشق پر مغرور ہے دل

ترے جلوے کا ہے جس دن سے مسکن — جوابِ جلوہ گاہِ طور ہے دل

دو عالم کو بھلا دیں کیوں نہ اختر
کہ اُس کی یاد سے معمور ہے دل

○

لیلئ عشق کو درکار ہیں دیوانے چند
نجد میں پھر نظر آنے لگے ویرانے چند

اللہ اللہ تری آنکھوں کا چھلکتا ہوا کیف
جیسے مستی میں الٹ دے کوئی پیمانے چند

اب بھی آغازِ جوانی کے فسانے ہیں یاد
اب بھی آنکھوں میں ہیں آباد پری خانے چند

چٹکیاں لینے لگا دل میں نشاطِ طفلی
آج یاد آ گئے بھولے ہوئے افسانے چند

دل کہیں رازِ محبت کو نہ کر دے افشا
آج محفل میں نظر آتے ہیں بیگانے چند

بجلیاں کالی گھٹاؤں میں ہیں یوں آوارہ
جیسے کہسار پہ رقصاں ہوں پری خانے چند

کیا کہوں کیا ہے خدا اور مذاہب کا ہجوم
اک حقیقت پہ ہیں چھائے ہوئے افسانے چند

حافظ و بیدل و خیام ہوں یا غالب و میر

بادۂ شعر کے ہیں بس یہی مستانے چند

بزم ہستی سے نکالے گئے اختر کیا جلد

ابھی پینے بھی نہیں پائے تھے پیمانے چند

○

نکہتِ زلف سے نیندوں کو بسا دے آکر
میری جاگی ہوئی راتوں کو سلا دے آکر

فکرِ فردا و غمِ دوش، بھلا دے آکر
پھر اسی ناز سے دیوانہ بنا دے آکر

عشق کو نغمۂ امید سنا دے آکر
دل کی سوئی ہوئی قسمت کو جگا دے آکر

کس قدر تیرہ و تاریک ہے دنیائے حیات
جلوۂ حسن سے اک شمع جلا دے آکر

عشق کی چاندنی راتیں مجھے یاد آتی ہیں
عمرِ رفتہ کو مری مجھ سے ملا دے آکر

زندگی بن کے مرے دل میں سما جا سلمٰی
موت اک پردہ ہے یہ پردہ اٹھا دے آکر

آگ سی دل میں لگا جاتا ہے تیرا ہر خط
آ مرے خرمنِ ہستی کو جلا دے آکر

تیری فرقت میں مرے شعر ہیں کتنے غمگین
مسکراتی ہوئی نظروں سے ہنسا دے آکر

پھر وہی ہم ہوں وہی دن ہوں وہی راتیں ہوں
عہدِ رفتہ کو پھر آئینہ دکھا دے آکر

شوقِ نادیدہ میں لذت ہے، مگر ناز نہیں
آ مرے عشق کو مغرور بنا دے آکر

شبِ فرقت یہ مری ہنستے ہیں آخر تو نور
میرے قدموں پہ ستاروں کو گرا دے آکر

تشنۂ حسن ہوں اے ساقیٔ میخانۂ حسن
اپنے ہونٹوں سے پھر اک جام پلا دے آکر

کب تلک رونقِ شام اودھ آمادہ رواں؟ — شام لاہور کو بھی صبح بنا دے آ کر
ہو چکی سیرِ بہاراں کدۂ قیصر باغ — باغِ لارنس میں بھی پھول کھلا دے آ کر
گومتی دیکھ چکی جلوۂ عارض کی بہار — سطحِ راوی کو بھی آئینہ بنا دے آ کر

نیا رومان نیا خواب ہے اختر کے لیے
آ! اور اس خواب کی تعبیر بنا دے آ کر

○

یقینِ وعدہ نہیں، تابِ انتظار نہیں — کسی طرح بھی دلِ زار کو قرار نہیں
شبوں کو خواب نہیں، خواب کو قرار نہیں — کہ زیبِ دوش وہ گیسوئے مشکبار نہیں
کلی کلی میں سمائی ہے نکہتِ سلمیٰ — شمیمِ حور ہے یہ بوئے نو بہار نہیں
کہاں کہاں نہ ہوئے ماہ وش جدا ہم سے — کہاں کہاں مری امید کا مزار نہیں
غموں کی فصل ہمیشہ رہی تر و تازہ — یہ وہ خزاں ہے کہ شرمندۂ بہار نہیں
بہار آئی ہے ایسے میں تم بھی آ جاؤ — "کہ زندگی کا برنگِ گل اعتبار نہیں"
کسی کی زلفِ پریشاں کا سایہ رقصاں ہے — فضا میں بال فشاں ابرِ نو بہار نہیں
ستارہ وار وہ پہلو میں آ گئے شب کو — سحر سے کہہ دو کہ محفل میں آج بار نہیں
گلِ فسردہ بھی اک طرفہ حسن رکھتا ہے — خزاں یہ ہے تو مجھے حسرتِ بہار نہیں
ہر ایک جام پہ یہ نغمۂ حزیں ساقی — "کہ اس جوانیِ فانی کا اعتبار نہیں!"
خدا نے بخش دیئے میرے دل کو غم اتنے — کہ اب میں اپنے گناہوں پہ شرمسار نہیں

چمن کی چاندنی راتیں ہیں کس قدر ویراں
کہ اس بہار میں وہ ماہِ نوبہار نہیں
شریکِ سوز نہیں پروانے، شمع کے اختر
ہمارے دل کا مگر کوئی غمگسار نہیں

○

آؤ بے پردہ تمہیں جلوۂ پنہاں کی قسم
ہم نہ چھیڑیں گے ہمیں زلفِ پریشاں کی قسم
چاکِ داماں کی قسم، چاکِ گریباں کی قسم
ہنسنے والے تجھے اس حالِ پریشاں کی قسم
میرے ارمان سے واقف نہیں شرمائیں گے آپ
آپ کیوں کھاتے ہیں ناحق مرے ارماں کی قسم
نیند آئی نہ کبھی تجھ سے بچھڑ کر ظالم
اپنی آنکھوں کی قسم، تیرے شبستاں کی قسم
لبِ جاناں پہ فدا، عارضِ جاناں کے نثار
شامِ رنگیں کی قسم، صبحِ درخشاں کی قسم
آج تک صبحِ وطن یاد ہے ہم کو اختر
دردِ ہجراں کی قسم، شامِ غریباں کی قسم

○

مجھے اپنی پستی کی شرم ہے تری رفعتوں کا خیال ہے
مگر اپنے دل کو میں کیا کروں، اسے پھر بھی شوقِ وصال ہے

اس ادا سے کون یہ جلوہ گر سرِ بزمِ حسنِ خیال ہے
جو نفس ہے مستِ بہار ہے، جو نظر ہے غرقِ جمال ہے

انھیں ضد ہے عرضِ وصال سے مجھے شوقِ عرضِ وصال ہے
وہی اب بھی اُن کا جواب ہے، وہی اب بھی میرا سوال ہے

تری یاد میں ہوا جب سے گم، ترے گم شدہ کا یہ حال ہے
کہ نہ دُور ہے نہ قریب ہے، نہ فراق ہے نہ وصال ہے

تری بزم، خلوتِ لامکاں، ترا آستاں مہ و کہکشاں
مگر اے ستارۂ آرزو! مجھے آرزوئے وصال ہے

میں وطن میں رہ کے بھی بے وطن کہ نہیں ہے ایک بھی ہم سخن
ہے کوئی شریکِ غم و محن تو وہ اک نسیمِ شمال ہے

میں بتاؤں واعظِ خوش نوا ہے جہان و خلد میں فرق کیا
یہ اگر فریبِ خیال ہے، وہ فریبِ حسنِ خیال ہے

یہی دادِ قصۂ غم ملی کہ نظر اٹھی، نہ زباں ہلی
فقط اک تبسّمِ شرمگیں، مری بے کسی کا مآل ہے

وہ خوشی نہیں ہے وہ دل نہیں مگر ان کا سایہ سا ہم نشیں
فقط ایک غمزدہ یاد ہے، فقط اک فسردہ خیال ہے
کہیں کس سے اخترِ بے نوا ہمیں بزمِ دہر سے کیا ملا
وہی ایک ساغرِ زہرِ غم جو حریفِ نوشِ کمال ہے

○

تمنّاؤں کو زندہ، آرزوؤں کو جواں کر لوں
یہ شرمیلی نظر کہہ دے تو کچھ گستاخیاں کر لوں
بہار آئی ہے، بلبل دردِ دل کہتی ہے پھولوں سے
کہو تو میں بھی اپنا دردِ دل تم سے بیاں کر لوں
ہزاروں شوخ ارماں لے رہے ہیں چٹکیاں دل میں
حیا اُن کی اجازت دے تو کچھ بے باکیاں کر لوں
کوئی صورت تو ہو دنیائے فانی میں بہلنے کی
ٹھہر جا اے جوانی! ماتمِ عمرِ رواں کر لوں
چمن میں ہیں بہم، پروانہ و شمع و گل و بلبل
اجازت ہو تو میں بھی حالِ دل اپنا بیاں کر لوں
کسے معلوم کب، کس وقت، کس پر گر پڑے بجلی
ابھی سے میں چمن میں چل کر آباد آشیاں کر لوں

بر آئیں حسرتیں کیا کیا، اگر موت اتنی فرصت دے

کہ اک بار اور زندہ شیوۂ عشقِ جواں کر لوں

مجھے دونوں جہاں میں ایک وہ مل جائیں گر اخترؔ

تو اپنی حسرتوں کو بے نیازِ دو جہاں کر لوں

○

ہمارے ہاتھ میں کب ساغرِ شراب نہیں؟

ہمارے قدموں پہ کس روز ماہتاب نہیں

جہاں میں اب کوئی صورت پئے ثواب نہیں

وہ مے کدے نہیں، ساقی نہیں، شراب نہیں

شبِ بہار میں زلفوں سے کھیلنے والے

ترے بغیر، مجھے آرزوئے خواب نہیں

چمن میں بلبلیں اور انجمن میں پروانے

جہاں میں کون غمِ عشق سے خراب نہیں

سکوتِ حسن کے لب پر ہیں مستیاں گویا

بہار جاگ رہی ہے، وہ محوِ خواب نہیں

وہی ہیں وہ، وہی ہم ہیں، وہی تمنّا ہے

الٰہی کیوں تری دنیا میں انقلاب نہیں

ہے شام و صبح سے بیگانہ غم کدہ دل کا
چراغِ ماہ نہیں، شمعِ آفتاب نہیں

شباب مٹ چکا، یادِ شباب باقی ہے
ہے بُو شراب کی، ساغر میں اب شراب نہیں

سُنا یہ نغمہ، ستاروں کی چھاؤں میں مطرب
کہ رات بھر کی ہے اک روشنی، شراب نہیں

دریچۂ مہ و انجم سے جھانکنے والے
ہوئی ہے عمر کہ میں آشنائے خواب نہیں

غم، آہ عشق کے غم کا کوئی نہیں موسم
بہار ہو کہ خزاں کب یہ اضطراب نہیں

حریمِ عرش کے سینے سے آ رہی ہے صدا
کہ اہلِ دل کی جگہ، عالمِ خراب نہیں

امیدِ پُرسشِ احوال ہو تو کیوں کر ہو
سلام کا بھی تری بزم میں جواب نہیں

بجھا سا رہتا ہے دل جب سے ہیں وطن سے جدا
وہ صحنِ باغ نہیں، سیرِ ماہتاب نہیں

بسے ہوئے ہیں نگاہوں میں وہ حسیں کوچے
ہر ایک ذرہ جہاں کم ز آفتاب نہیں
وہ باغ و راغ کے دلچسپ و دلنشیں منظر
کہ جن کے ہوتے ہوئے خلد مثلِ خواب نہیں
وہ جوئبارِ رواں کا طرب فزا پانی
شراب سے نہیں کچھ کم اگر شراب نہیں
برنگِ زلفِ پریشاں، وہ موجہائے رواں
کہ جن کی یاد میں راتوں کو فکرِ خواب نہیں
سما رہے ہیں نظر میں وہ مہوشانِ حرم
حرم ہیں جن کے ستارے بھی باریاب نہیں
وطن کا چھیڑ دیا کس نے تذکرہ اختر
کہ چشمِ شوق کو پھر آرزوئے خواب نہیں

○

وہ کہتے ہیں رنجش کی باتیں بھلا دیں | محبت کریں خوش رہیں مسکرا دیں
غرور اور ہمارا غرورِ محبت | مہ و مہر کو ان کے در پر جھکا دیں
جوانی ہو گر جاودانی تو یارب | تری سادہ دنیا کو جنت بنا دیں
شبِ وصل کی بیخودی چھا رہی ہے | کہو تو ستاروں کی شمعیں بجھا دیں

بہاریں ہمٹ آئیں کھل جائیں کلیاں — جو ہم تم چمن میں کبھی مسکرا دیں
عبادت ہے اک بیخودی سے عبارت — حرم کو مئے مشک بو سے بسا دیں
وہ آئیں گے آج اے بہارِ محبت — ستاروں کے بستر پہ کلیاں بچھا دیں
بناتا ہے منہ تلخیِ مے سے زاہد — تجھے باغِ رضواں سے کوثر منگا دیں
جنھیں عمر بھر یاد آنا سکھایا — وہ دل سے تری یاد کیونکر بھلا دیں
تم افسانۂ قیس کیا پوچھتے ہو — اِدھر آؤ ہم تم کو لیلیٰ بنا دیں
یہ بے دردیاں کب تک اے دردِ غربت — بتوں کو پھر ارضِ حرم میں بسا دیں
وہ سرمستیاں بخش اے رشکِ شیریں — کہ خسرو کو خوابِ عدم سے جگا دیں
ترے وصل کی بیخودی کہہ رہی ہے — خدائی تو کیا ہم خدا کو بھلا دیں

انھیں اپنی صورت پہ یوں ناز کب تھا
مرے عشقِ رسوا کو اختر دعا دیں

○

جھوم کر بدلی اُٹھی اور چھا گئی — ساری دنیا پر جوانی آ گئی
آہ! وہ اس کی نگاہِ مے فروش — جب کبھی اٹھی مستیاں برسا گئی
گیسوئے مشکیں میں وہ روئے حسیں — ابر میں بجلی سی اک لہرا گئی
عالمِ مستی کی توبہ، الاماں — پارسائی نشّہ بن کر چھا گئی
آہ اس کی بے نیازی کی نظر — آرزو کیا پھول سی کمھلا گئی

سازِ دل کو گدگدایا عشق نے موت کو لے کر جوانی آگئی
پارسائی کی جوانمرگی نہ پوچھ توبہ کرنی تھی کہ بدلی چھا گئی

اختر اس جانِ تمنّا کی ادا
جب کبھی یاد آگئی تڑپا گئی

○

عمر بھر کی تلخ بیداری کا ساماں ہو گئیں
ہائے وہ راتیں کہ جو خوابِ پریشاں ہو گئیں

میں فدا اس چاند سے چہرے پہ جس کے نور سے
میرے خوابوں کی فضائیں یوسفستاں ہو گئیں

عمر بھر کم بخت کو پھر نیند آ سکتی نہیں
جس کی آنکھوں پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

دل کے پردوں میں تھیں جو جو حسرتیں پردہ نشیں
آج وہ آنکھوں میں آنسو بن کے عریاں ہو گئیں

کچھ تجھے بھی ہے خبر او سونے والے ناز سے
میری راتیں لُٹ گئیں، نیندیں پریشاں ہو گئیں

ہائے وہ مایوسیوں میں میری امیدوں کا رنگ
جو ستاروں کی طرح اُٹھ اُٹھ کے پنہاں ہو گئیں

بس کرو، او میری رونے والی آنکھوں بس کرو

اب تو اپنے ظلم پر وہ بھی پشیماں ہوگئیں

آہ، وہ دن، جو نہ آئے پھر گزر جانے کے بعد

ہائے وہ راتیں کہ جو خوابِ پریشاں ہوگئیں

گلشنِ دل میں کہاں اخترؔ وہ رنگِ نوبہار

آرزوئیں چند کلیاں تھیں پریشاں ہوگئیں

○

جھوم کر اُٹھی ہے پھر کہسار سے کالی گھٹا

کیسی مستانہ گھٹا ہے، کتنی متوالی گھٹا

دیکھنا کیسا یہ برکھا رُت نے جادو کر دیا

ہر کلی بجلی بنی ہے اور ہر ڈالی گھٹا

سبزہ و گل جھومتے ہیں، دشت و گلشن مست ہیں

مے کدے برسا رہی ہے ہو کے متوالی گھٹا

چھائی ہے کس دھوم سے گلزار و کوہ و دشت پر

آہ یہ پہلی گھٹا، رنگیں گھٹا، کالی گھٹا

اُن کی زلفِ مشکبو کی بُو چرا کر لائی ہے

ورنہ کیوں آتی ہے اتراتی ہوئی کالی گھٹا

سبز مخمل سی بچھی جاتی ہے فرشِ خاک پر

ہر طرف لہرا رہی ہے کیسی ہریالی گھٹا

دل سے آتی ہیں صدائیں، بیخودیِ شوق ہیں

میرے سینہ میں سما جائے یہ متوالی گھٹا

اُن کو بھی ہمراہ لے آتی تو کوئی بات تھی

ورنہ اختر سچ یہ ہے کس کام کی کالی گھٹا

○

تازہ بتازہ، نو بنو، جلوہ بہ جلوہ چھائے جا

پھولوں میں مسکرائے جا، تاروں میں جگمگائے جا

خواب و خیال کی طرح، آنکھ میں، دل میں آئے جا

آنکھ کو بے قراریاں، دل کو جنوں سکھائے جا

فتنۂ غم جگائے جا، حشرِ ستم اٹھائے جا

نیچی نظر کیے ہوئے بام پہ مسکرائے جا

ساقیِ دہر سے کہو، مستِ شرابِ غم ہیں ہم

شام و سحر پلائے جا، ظرف کو آزمائے جا

میں ہوں وہ مست جس کو ہے کیف کی لذتوں کا ذوق

شام و سحر کے جام ہیں، شمس و قمر پلائے جا

ہاں تجھے مجھ سے کیا غرض، میری خوشی سے کیا غرض
تُو تو نگاہ پھیر کر دور سے مُسکرائے جا

دورِ جہاں سے ساقیا، سرد ہوا ہے دل مرا
برف و شراب کی جگہ، برق و شرر پلائے جا

طور خراب ہو نہ ہو، دید کی تاب ہو نہ ہو
کوئی جواب ہو نہ ہو، برقِ نظر گرائے جا

دل کی رگوں میں مطربہ شعلے سے تیرنے لگے
بس یہی نغمہ گائے جا، بس اسی دُھن میں گائے جا

منزلِ ماہ و کہکشاں، وسعتِ نیم گام ہے
عشق کی راہ میں یہی نغمۂ شوق گائے جا

تیرے اور اس کے درمیاں تیری خودی حجاب ہے
اپنا نشان کھوئے جا، اس کا مقام پائے جا

بھولنے کا خیال بھی ایک طرح کی یاد ہے
ہم نہ بُھلائے جائیں گے، لاکھ ہمیں بھلائے جا

نالۂ نیم شب مرا سُن کے کسی نے دی صدا
طالبِ لذّتِ بقا، درد کو دل بنائے جا

دل مرا سراسر گداز، تیری حیا عدوئے راز
مجھ سے کبھی ضبطِ غم نہ ہو تو کبھی نظر چرائے جا

سایۂ ابر ہے شباب، حاصلِ زندگی خراب
سازِ طرب بجائے جا، نغمۂ کیف گائے جا

زندگی دوام کیا، منّتِ صبح و شام کیا
عمر ہے مختصر تو ہو، عمرِ طرب بڑھائے جا

ہاں یونہی مطربِ فراق، نغمۂ دردِ اشتیاق
اس کے تصوّرات سے سینے کو جگمگائے جا

جام بہ جام، خُم بہ خُم، غنچہ بہ غنچہ، گُل بہ گُل
نکہت و رنگ لائے جا، لذّتِ طرب پلائے جا

پردہ ہے عرضِ حال کا، نغمہ و شعر کی زباں
اخترِ غم نوا انھیں اپنی غزل سُنائے جا

○

محبّت کی دنیا میں مشہور کر دوں
مری سادہ دل تجھ کو مغرور کر دوں

ترے دل کو ملنے کی خود آرزو ہو
تجھے اس قدر غم سے رنجور کر دوں

مجھے زندگی دُور رکھتی ہے تجھ سے
جو تو پاس ہو تو اُسے دور کر دوں

محبّت کے اقرار سے شرم کب تک
کبھی سامنا ہو تو مجبور کر دوں

مرے دل میں ہے شعلۂ حسن رقصاں
میں چاہوں تو ہر ذرّے کو طور کر دوں

یہ بے رنگیاں کب تک اے حُسنِ رنگیں
اِدھر آ تجھے عشق میں چُور کر دوں

تو گر سامنے ہو تو میں بے خودی میں
ستاروں کو سجدے پہ مجبور کر دوں

سیہ خانۂ غم ہے ساقی، زمانہ
بس اک جام اور یونہی نور کر دوں

نہیں زندگی کو وفا ورنہ اختر
محبت سے دنیا کو معمور کر دوں

○

زمانِ ہجر مٹے، دورِ وصلِ یار آئے
الٰہی اب تو خزاں جائے اور بہار آئے

ستم ظریفیٔ فطرت، یہ کیا معمّہ ہے
کہ جس کلی کو کبھی سونگھوں میں بوئے یار آئے

چمن کی ہر کلی، آمادۂ تبسّم ہے
بہار بن کے مری جانِ نو بہار آئے

ہیں تشنہ کام ہم ان بادلوں سے پوچھے کوئی
کہاں بہار کی پریوں کے تخت اُتار آئے

کسی کا شکوہ عبث یہ دعائیں مانگ اے دل
کہ اب ملیں تو ہمیں اس قدر نہ پیار آئے

ترے خیال کی ہے تابیاں معاذ اللہ
کہ ایک بار بھلائیں تو لاکھ بار آئے
گھٹا وہ اٹھی ہے پھر بمبئی کے ساحل سے
کہ مجھ تلک اگر آئے تو مشکبار آئے
وہ آئیں یوں مرے آغوشِ عشق میں اخترؔ
کہ جیسے آنکھوں میں اک خوابِ بے قرار آئے

○
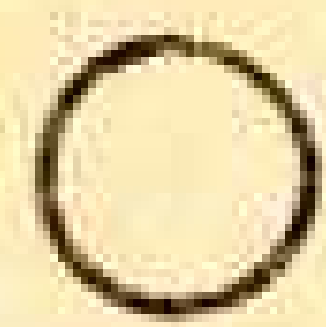
سوئے کلکتہ جو ہم بادلِ دیوانہ چلے
گنگناتے ہوئے اک شوخ کا افسانہ چلے
شہرِ سلمیٰ ہے سرِ راہ، گھٹائیں ہمراہ
ساقیا آج تو دورِ مے و پیمانہ چلے
اس طرح ریل کے ہمراہ رواں ہے بادل
ساتھ جیسے کوئی اڑتا ہوا میخانہ چلے
شہرِ جاناں میں اترنے کی تھی ہم پہ قدغن
یوں چلے جیسے کوئی شہر سے بیگانہ چلے
گرچہ تنہا تھے مگر ان کے تصور کے نثار
اپنے ہمراہ لیے ایک پری خانہ چلے

کھیل اُمّید کے دیکھو کہ نہ کی ان کو خبر
پھر بھی ہم منتظرِ جلوۂ جانانہ چلے

اُن کا پیغام نہ لائے ہوں یہ رنگیں بادل
ورنہ کیوں ساتھ مرے بیخود و مستانہ چلے

گھر سے باعشرتِ شاہانہ ہم آئے تھے مگر
اُن کے کوچے سے چلے جب تو فقیرانہ چلے

یاد لو! خدمتِ سلمٰی میں یہ کہہ دو جا کر
کہ ترے شہر میں ہم آ کے غریبانہ چلے

حسرت و شوق کے عالم میں چلے یوں اختؔر
مُسکراتا ہوا جیسے کوئی دیوانہ چلے

○

کس کی آنکھوں کا لیے دل پہ اثر جاتے ہیں
مے کدے ہاتھ بڑھاتے ہیں جدھر جاتے ہیں

دل میں ارمانِ وصال، آنکھ میں طوفانِ جمال
ہوش باقی نہیں جانے کا مگر جاتے ہیں

بھولتی ہی نہیں دل کو تری مستانہ نگاہ
ساتھ جاتا ہے یہ مے خانہ جدھر جاتے ہیں

پاسبانانِ حیا کیا ہوئے اے دولتِ حسن؟

ہم جو آکر تری دزدیدہ نظر جاتے ہیں

پرسشِ دل تو کجا یہ بھی نہ پوچھا اس نے

ہم مسافر کدھر آئے تھے کدھر جاتے ہیں

چشمِ حیراں میں سمائے ہیں یہ کس کے جلوے

طور ہر گام پہ رقصاں ہیں جدھر جاتے ہیں

جس طرح بھولے مسافر کوئی ساماں اپنا

ہم یہاں بھول کے دل اور نظر جاتے ہیں

کتنے بے درد ہیں اس شہر کے رہنے والے

راہ میں چھین کے دل کہتے ہیں گھر جاتے ہیں

اگلے وقتوں میں لٹا کرتے تھے رہرو اکثر

ہم تو اس عہد میں بھی لُٹ کے مگر جاتے ہیں

فیض آباد سے پہنچا ہمیں یہ فیض اختر

کہ جگر پر لیے ہم داغِ جگر جاتے ہیں

○
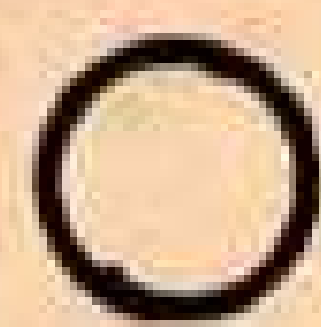
یارو کوئے یار کی باتیں کریں
پھر گل و گلزار کی باتیں کریں

چاندنی میں اے دل اک اک پھول سے
اپنے گل رخسار کی باتیں کریں

آنکھوں آنکھوں میں لٹائے میکدے
دیدۂ سرشار کی باتیں کریں

اب تو لیجئے بس لڑائی ہو چکی
اب تو چلیئے پیار کی باتیں کریں

پھر مہک اُٹھے فضائے زندگی
پھر گلِ رخسار کی باتیں کریں

محشرِ انوار کر دیں بزم کو
جلوۂ دیدار کی باتیں کریں

اپنی آنکھوں سے بہائیں سیلِ اشک
ابرِ گوہر بار کی باتیں کریں

اُن کو اُلفت ہی سہی اغیار سے
ہم سے کیوں اغیار کی باتیں کریں

اختر اس رنگیں ادا سے رات بھر
طالعِ بیمار کی باتیں کریں

○

بجا کہ ہے پاسِ حشر ہم کو کریں گے پاسِ شباب پہلے
حساب ہوتا ہے گا یا رب ہمیں منگا دے شراب پہلے

فضائے شب ہنس کے جگمگائی، وہ نازنیں صبح بن کے آئی
ہوا ہے روشن مرے شبستاں میں چاند سے آفتاب پہلے

زباں پہ آیا نہ حرفِ مطلب رکھ گئیں کچھ مستر یہ نظریں
سوال کرنے نہ پائے ہیں ہم کہ مل گیا ہے جواب پہلے

جناں میں پہلے پہل پیئے گا، تو لڑکھڑاتا پھرے گا زاہد
سرِ دکوثر کی ہے اگر دھن جہاں میں پی لے شراب پہلے

ہے خسروِ عشق کا یہ فرماں، کہ دل لگانا نہیں ہے آساں
جیسے ہو کوئے بتاں کا ارماں، وہ کو بکو ہو خراب پہلے

غم و الم، رنج و یاس و حسرت اٹھاؤں گا سب کے رخ سے پردے
تمہیں قسم ہے دلِ حزیں کی، اٹھاؤ تو تم نقاب پہلے

الٰہی، وہ بوئے پیرہن سے کبھی پہلے ہو ہمکنار آ کر
چمن میں ہوتا ہے جلوہ افروز پھول سے ماہتاب پہلے

یہ کس کے رنگِ رخِ بہاریں نے بخش دی ہے طراوتِ نو
شگفتہ ہوتا نہ تھا گلستاں میں اس ادا سے گلاب پہلے

نگاہ ساقی کی مسکرائی، کہا جب اختر نے اپنی دھن میں
پئیں گے، پیتے رہیں گے مے کش، مگر یہ خانہ خراب پہلے

○

وہ فتنہ کار زیبِ شبستاں ہے آج کل
کیا محوِ خوابِ شورشِ دوراں ہے آج کل

ہے خوفِ محتسب بھی خیالِ حساب بھی
لاہور گرچہ جنتِ رنداں ہے آج کل

دنیا نے گو جلا کے ہمیں خاک کر دیا
پھر بھی دماغِ عشق گلستاں ہے آج کل

پھر ابر چھا رہا ہے بہاریں لیے ہوئے
پھر سامنے وہ زلفِ پریشاں ہے آج کل

فصلِ بہار و روئے نگار و مئے کہن
حاصل ہر ایک طرح کا ساماں ہے آج کل

کہہ دو سحر سے ہم کو نہیں فرصتِ نظر
معمورِ حسنِ رنگ شبستاں ہے آج کل

ایمان کو عزیز رکھیں ہم تو کس طرح
پیشِ نظر وہ غارتِ ایماں ہے آج کل
بھولا نہیں سبق ابھی دیرینہ عشق کا
اختر کو گرچہ شکوۂ دوراں ہے آج کل

○

جھنڈے گڑے ہیں باغ میں ابرِ بہار کے
قربان جاؤں رحمتِ پروردگار کے
گلشن میں چند راتیں خوشی کی گزار کے
ابرِ رواں کے ساتھ گئے دن بہار کے
وہ رنگ اب کہاں چمنِ روزگار کے
بلبل کے نغمے ہیں نہ ترانے ہزار کے
رسوائی کے دن آئے کسی میگسار کے
آنے لگے سلام چمن سے بہار کے
بے تاب ولولے ہیں ترے انتظار کے
آ اے مری بہار دن آئے بہار کے
ابرِ سیہ میں برقِ حسیں لہلہا اُٹھی
یا آ گئے وہ سامنے گیسو سنوار کے

اے ابر! اب لے سنبھال کہ ہم ہاتھ سے چلے

اے توبہ الوداع دن آئے بہار کے

باغوں پہ جھوم جھوم کے بادل نہیں اُٹھے

گیسو بکھر رہے ہیں عروسِ بہار کے

آؤ کہ ایسا وقت نہ پاؤ گے پھر کبھی

آتے ہیں روز روز کہاں دن بہار کے

اختر کسی کے گھر سے اس انداز سے چلے

جیسے گزار آئے ہوں دن سب بہار کے

○

غمِ زمانہ نہیں اک عذاب ہے ساقی

شراب لا مری حالت خراب ہے ساقی

شباب کے لیے توبہ عذاب ہے ساقی

شراب لا مجھے پاسِ شباب ہے ساقی

اُٹھا پیالہ کہ گلشن پہ پھر برسنے لگی

وہ مے کہ جس کا قدح ماہتاب ہے ساقی

نکال پردۂ مینا سے دخترِ رز کو

گھٹا میں کس لیے یہ ماہتاب ہے ساقی

تو واعظوں کی نہ سُن میکشوں کی خدمت کر
گنہ ثواب کی خاطر ثواب ہے ساقی

زمانے بھر کے غموں کو ہے دعوتِ غرّا
کہ ایک جام میں سب کا جواب ہے ساقی

کلام جس کا ہے معراجِ حافظ و خیّام
یہی وہ اخترِ خانہ خراب ہے ساقی

○

اُن کو بلائیں اور وہ نہ آئیں تو کیا کریں؟
بے کار جائیں اپنی دعائیں تو کیا کریں؟

اک زہرہ وش ہے آنکھ کے پردوں میں جلوہ گر
نظروں میں آسماں نہ سمائیں تو کیا کریں؟

مانا کہ سب کے سامنے ملنے سے ہے حجاب
لیکن وہ خواب میں بھی نہ آئیں تو کیا کریں؟

ہم لاکھ قسمیں کھائیں نہ ملنے کی سب غلط
وہ دُور ہی سے دل کو لبھائیں تو کیا کریں؟

بد قسمتوں کا، یاد نہ کرنے پہ ہے یہ حال
اللہ! اگر وہ یاد ہی آئیں تو کیا کریں؟

ناصح! ہماری توبہ میں کچھ شک نہیں مگر
شانہ ہلائیں آ کے گھٹائیں تو کیا کریں؟
میخانہ دُور، راستہ تاریک، ہم مریض
منہ پھیر دیں اُدھر جو ہوائیں تو کیا کریں؟
راتوں کے دل میں یاد بسائیں کسی کی ہم
اخترؔ حرم میں وہ نہ بلائیں تو کیا کریں؟

○

لے آئے انقلابِ سپہرِ بریں کہاں؟
اللہ ہم کہاں، وہ ثریّا جبیں کہاں؟
در ہے نہ آستاں، نہ حرم ہے نہ بتکدہ
یا رب مچل پڑی ہے ہماری جبیں کہاں؟
سورج کی سب سے پہلی کرن خوشنما سہی
لیکن تری نظر کی طرح دل نشیں کہاں؟
دامن کشِ نظر ہے کسی کا حریمِ ناز
دنیا میں آگئی یہ بہشتِ بریں کہاں؟
آنکھوں نے ذرّے ذرّے پہ سجدے لٹائے ہیں
کیا جانے جا چھپا مرا پردہ نشیں کہاں؟

کوثر پلا کے ہم سے نہ حوریں کریں مذاق
ہم رندِ تلخ نوش کہاں، انگبیں کہاں؟
زاہد تری بہشت میں حوریں سہی مگر
ہم جس کو چاہتے ہیں وہ زہرہ جبیں کہاں؟
ساقی کی چشمِ مست کا صدقہ ہے ورنہ شیخ
اختر کہاں، یہ شعلۂ مینا نشیں کہاں؟

○

لا پلا ساقی، شرابِ ارغوانی پھر کہاں؟
زندگانی پھر کہاں، ناداں جوانی پھر کہاں؟
دو گھڑی مل بیٹھنے کو بھی غنیمت جانیئے
عمر فانی ہی سہی، یہ عمرِ فانی پھر کہاں؟
آ کہ ہم بھی اک ترانہ جھوم کر گاتے چلیں
اس چمن کے طائروں کی ہمزبانی پھر کہاں؟
ہے زمانہ عشقِ سلمیٰ میں گنوا دے زندگی
یہ زمانہ پھر کہاں، یہ زندگانی پھر کہاں؟
ایک ہی بستی میں ہیں، آساں ہے ملنا آ ملو
کیا خبر لے جائے، دورِ آسمانی پھر کہاں؟

فصلِ گل جانے کو ہے، دورِ خزاں آنے کو ہے
یہ چمن، یہ بلبلیں، یہ نغمہ خوانی پھر کہاں؟

پھول چُن جی کھول کر عیش و طرب کے پھول چُن
موسمِ گل پھر کہاں فصلِ جوانی پھر کہاں؟

آخری رات آ گئی، جی بھر کے مل لیں آج تو
تم سے ملنے دے گا دورِ آسمانی پھر کہاں؟

آج آئے ہو تو سُنتے جاؤ یہ تازہ غزل
ورنہ اختر پھر کہاں، یہ شعر خوانی پھر کہاں

○

دلِ دیوانہ و اندازِ بے باکانہ رکھتے ہیں
گدائے میکدہ ہیں، وضعِ آزادانہ رکھتے ہیں

مجھے میخانہ، تھراتا ہوا محسوس ہوتا ہے
وہ میرے سامنے شرما کے جب پیمانہ رکھتے ہیں

گھٹائیں بھی تو بہکی جا رہی ہیں ان اداؤں پر
چمن میں جب قدم رکھتے ہیں وہ مستانہ رکھتے ہیں

بظاہر ہم ہیں بلبل کی طرح مشہور، ہر جائی
مگر دل میں گدازِ فطرتِ پروانہ رکھتے ہیں

جوانی بھی تو اک موجِ شرابِ تند و رنگیں ہے
بُرا کیا ہے اگر ہم مشربِ رندانہ رکھتے ہیں
کسی مغرور کے آگے ہمارا سر نہیں جھکتا
فقیری میں بھی اخترؔ غیرتِ شاہانہ رکھتے ہیں

○

بھلا کیوں کر نہ ہوں راتوں کو نیندیں بیقرار اُس کی
کبھی لہرا چکی ہو جس پہ زلفِ مشکبار اُس کی
امیدِ وصل پر، دل کو فریبِ صبر کیا دیجے
ادا وحشی صفت اس کی، نظر بیگانہ وار اُس کی
محبّت تھی مگر یہ بے قراری تو نہ تھی پہلے
الٰہی آج کیوں یاد آتی ہے بے اختیار اُس کی
تجھے تو عشقِ پیچاں ایسے بل کھاتے نہ آتے تھے
بتا کیا تجھ پہ لہرائی ہے زلفِ عطر بار اُس کی
مئے الفت کے سرشاروں کو میخانے سے کیا مطلب
ادا روحِ نشاط اس کی، نظر جانِ بہار اُس کی
بُرا ہو اس تغافل کا، کہ تنگ آ کر یہ کہتا ہوں
مجھے کیوں ہو گئی اُلفت مرے پروردگار اُس کی

یہاں کیا دیکھتے ہو ناصحو! گھر میں دھرا کیا ہے
مرے دل کے کسی پردے میں ڈھونڈو یادگار اس کی

جفائے ناز کی میں نے شکایت، ہائے کیوں کی تھی
مجھے جینے نہیں دیتی نگاہِ شرمسار اس کی

ہمیں عرضِ تمنّا کی جسارت ہو تو کیوں کر ہو
نگاہیں فتنہ ریز اس کی، ادائیں حشر بار اس کی

کوئی کیوں کر بھلا دے، ہائے ایسے کی محبّت کو
وفائیں دل نواز اس کی، جفائیں خوشگوار اس کی

انہی کوچوں میں کل اخترؔ کو رسوا ہوتے دیکھا تھا
وہ آنکھیں اشکبار اس کی، وہ باتیں دلفگار اس کی

○

یاد آؤ، مجھے للّٰلہ نہ تم یاد کرو
اپنی اور میری جوانی کو نہ برباد کرو

شرم رونے بھی نہ دے، بیکلی سونے بھی نہ دے
اس طرح تو مری راتوں کو نہ برباد کرو

حد ہے پینے کی کہ خود پیرِ مغاں کہتا ہے
اس بری طرح جوانی کو نہ برباد کرو

یاد آتے ہو بہت، دل سے بھلانے والو
تم ہمیں یاد کرو، تم ہمیں کیوں یاد کرو

آسماں رتبہ محل اپنے بنانے والو
دل کا اُجڑا ہوا گھر بھی کوئی آباد کرو

"ہم کبھی آئیں، ترے گھر مگر آئیں گے ضرور"
تم نے یہ وعدہ کیا تھا کہ نہیں، یاد کرو

چاندنی رات میں گلگشت کو جب جاتے تھے
آہ عذرا کبھی اس وقت کو بھی یاد کرو

میں بھی شائستۂ الطافِ ستم ہوں شاید
میرے ہوتے ہوئے کیوں غیر پہ بیداد کرو

صدقے اس شوخ کے اختر یہ لکھا ہی جس نے
عشق میں اپنی جوانی کو نہ برباد کرو

○

اس مہ جبیں سے آج ملاقات ہو گئی
بے دردآسماں! یہ کیا بات ہو گئی؟

آوارگانِ عشق کا مسکن نہ پوچھئے
پڑ رہتے ہیں وہیں یہ جہاں رات ہو گئی

ذکرِ شبِ وصال ہو کیا، قصہ مختصر
جس بات سے وہ ڈرتے تھے وہ بات ہو گئی

مسجد کو ہم چلے گئے مستی میں بھول کر
ہم سے خطا یہ پیرِ خرابات ہو گئی

پچھلے غموں کا ذکر ہی کیا جب وہ ٹل گئے ۔۔۔ اے آسماں تلافیِ مافات ہو گئی

زاہد کو زندگی ہی میں کوثر چکھا دیا ۔۔۔ رندوں سے آج یہ بھی کرامات ہو گئی

بے چین رکھنے والے پریشاں ہوں خود نہ کیوں ۔۔۔ آخر کو تیری زلف مری رات ہو گئی

جھولا جھلائیں چل کے حسینوں کو باغ میں ۔۔۔ گجرات میں سنا ہے کہ برسات ہو گئی

کیا فائدہ اب اختر اگر پارسا بنے
جب ساری عمر نذرِ خرابات ہو گئی

○

بہشتوں پہ ہنستی ہے دنیائے فانی ۔۔۔ جوانی کی راتیں ہیں کتنی سہانی

ستم ہے کہ اے دل نہیں جاودانی ۔۔۔ حسینوں کا حسن اور ہماری جوانی

یہ سبزہ، یہ بادل، یہ رت یہ جوانی ۔۔۔ کدھر ہے مرا ساغرِ خسروانی

بھلا پھر کہاں ہم، کہاں تو جوانی ۔۔۔ پلا ساقیا بادۂ ارغوانی

ترا حسن، پروردۂ رنگ و بو ہے ۔۔۔ بہاروں میں کھیلی ہے تیری جوانی

صنم خانۂ سندھ خاموش کیوں ہے ۔۔۔ نہ وہ دلستاں ہیں نہ وہ دلستانی

مری بے خودی کو برا کہنے والے ۔۔۔ چھلکتی ہے ساغر میں کس کی جوانی

یہ حسرت رہی وہ کبھی آ کے سنتے ۔۔۔ ہماری کہانی، ہماری زبانی

سرِ بام او محوِ خوابِ بہاریں ۔۔۔ ستاروں پہ چھائی ہے تیری جوانی

مرا عشق بدنام ہے کیوں جہاں میں؟ ۔۔۔ ہے مشہور اختر جوانی دِوانی

نہ بھولیں گی کبھی اے ہم نشیں راتیں جوانی کی
وہ راتیں، وہ ملاقاتیں، وہ برساتیں جوانی کی
لبوں پر آہ، دل میں دھڑکنیں، آنکھوں میں اشکِ خوں
جوانی لے کر آئی ہے، یہ سوغاتیں جوانی کی
یہ مرجھائی ہوئی کلیاں نہیں، بے نور آنکھیں ہیں
بسی تھیں جن کے خوابوں میں کبھی راتیں جوانی کی
غمِ دنیا ستم، افسردگیِ دل قیامت ہے
سُنا لے آرزوئے رفتہ پھر باتیں جوانی کی
ہوئی مدت پر اب بھی یاد آتی ہیں ہمیں اختر
وہ راتیں عاشقی کی، وہ مناجاتیں جوانی کی

○

اشکباری نہ مٹی سینہ نگاری نہ گئی
لالہ کاری، کسی صورت بھی ہماری نہ گئی
کوچۂ حُسن چھُٹا، تو ہوئے رسوائے شراب
اپنی قسمت میں لکھی تھی جو وہ خواری نہ گئی
ان کی مستانہ نگاہوں کا نہیں کوئی قصور
ناصحو! زندگی خود ہم سے سنواری نہ گئی

چشمِ محزوں پہ نہ لہرائی، وہ زلفِ شاداب
یہ پری ہم سے کبھی شیشے میں اتاری نہ گئی

مدتیں ہو گئیں، بچھڑے ہوئے تم سے لیکن
آج تک دل سے مرے یاد تمہاری نہ گئی

شاد و خنداں رہے ہم یوں تو جہاں میں لیکن
اپنی فطرت سے کبھی درد شعاری نہ گئی

سینکڑوں بار مرے سامنے کی توبہ مگر
توبہ، اختر کہ تری بادہ گساری نہ گئی

○

عشق کہ حسن کے دین میں صبر و سکوں حرام ہے
ایک نظر کا کام ہے، ایک اثر کا نام ہے

گلکدۂ مجاز میں جس کا بہشت نام ہے
اس کی بہارِ حسن کی نکہتِ ناتمام ہے

فکر و نظر کی عفتیں، رنگِ ہوس میں غرق ہیں
اب تو جہانِ عشق میں ذوقِ گناہ عام ہے

پائے طلب کے واسطے کوئی نئی زمیں بنا
وادیِ مہر و ماہ تو لغزشِ نیم گام ہے

شان ہیں مے کی زاہد اب اس کے سوا میں کیا کہوں

میرے لیے حلال ہے، تیرے لیے حرام ہے

عشق میں، سوگوار سا، بے خود و بے قرار سا

تم کو خبر ہو یا نہ ہو، اخترؔ اسی کا نام ہے

○

سما کر دل میں نظروں سے نہاں ہے

مجھے یاد آنے والے تو کہاں ہے؟

خدائی کہکشاں کہتی ہے جس کو

وہ عذرا کا خرامِ رائیگاں ہے

اندھیرے بادلوں سے پوچھ زاہد

مری کھوئی ہوئی توبہ کہاں ہے؟

یہ کس نے پیار کی نظروں سے دیکھا

کہ میرے دل کی دنیا پھر جواں ہے

جوانی رائیگاں جائے تو اچھا

جوانی ایک خوابِ رائیگاں ہے

○

پھر وہی شہر، وہی کوئے بتاں سامنے ہے
پھر وہی دیر وہی بزمِ مغاں سامنے ہے
پھر وہی مست بہاریں ہیں مری راتوں پر
پھر اسی طرح، صفِ گلبدناں سامنے ہے
پھر مری غمزدہ آنکھوں میں خوشی ہے رقصاں
پھر مرا گم شدہ رویائے جواں سامنے ہے
پھر مرے لب پہ ہیں اشعار، رواں حافظؔ کے
پھر کوئی نغمۂ شادابِ جواں سامنے ہے
پھر فسوں کار ہے اک میکدۂ ابر بدوش
پھر کوئی دیدۂ افسانہ چکاں سامنے ہے

○

یوں تو کس پھول سے رنگت نہ گئی بو نہ گئی
اے محبت مرے پہلو سے مگر تو نہ گئی
مٹ چلے میری امیدوں کی طرح حرف مگر
آج تک تیرے خطوں سے تری خوشبو نہ گئی
کب بہاروں پہ ترے رنگ کا سایہ نہ پڑا؟
کب ترے گیسوؤں کو بادِ سحر چھو نہ گئی
ترے گیسوئے معنبر کو کبھی چھیڑا تھا
میرے ہاتھوں سے ابھی تک تری خوشبو نہ گئی

○

مری آنکھوں سے ظاہر خوں فشانی اب بھی ہوتی ہے
نگاہوں سے بیاں دل کی کہانی اب بھی ہوتی ہے
سرور آرا شرابِ ارغوانی اب بھی ہوتی ہے
مرے قدموں میں دنیا کی جوانی اب بھی ہوتی ہے
کوئی جھونکا تو لاتی اے نسیم اطرافِ کنعاں تک
سوادِ مصر میں عنبر فشانی اب بھی ہوتی ہے
وہ شب کو مُشک بُو پردوں میں چھپ کر آہی جاتے ہیں
مرے خوابوں پر اُن کی مہربانی اب بھی ہوتی ہے
کہیں سے ہاتھ آ جائے تو ہم کو بھی کوئی لا دے
سُنا ہے اس جہاں میں شادمانی اب بھی ہوتی ہے
ہلال و بدر کے نقشے سبق دیتے ہیں انساں کو
کہ ناکامی بنائے کامرانی اب بھی ہوتی ہے
کہیں اغیار کے خوابوں میں چُھپ چُھپ کر نہ جاتے ہوں
وہ پہلو میں ہیں لیکن بدگمانی اب بھی ہوتی ہے
سمجھتا ہے شکستِ توبہ اشکِ توبہ کو زاہد
مری آنکھوں کی رنگت ارغوانی اب بھی ہوتی ہے

وہ برساتیں، وہ باتیں، وہ ملاقاتیں کہاں ہمدم

وطن کی رات ہونے کو سہانی، اب بھی ہوتی ہے

خفا ہیں، پھر بھی آ کر چھیڑ جاتے ہیں تصور میں

ہمارے حال پر کچھ مہربانی، اب بھی ہوتی ہے

زباں ہی ہیں نہ ہوتا شیر تو میں کیا کروں ناصح

تری باتوں سے پیدا سرگرانی اب بھی ہوتی ہے

تمھارے گیسوؤں کی چھاؤں میں اک رات گزری تھی

ستاروں کی زباں پر یہ کہانی، اب بھی ہوتی ہے

پسِ توبہ بھی پی لیتے ہیں جامِ غنچہ و گل سے

بہاروں میں جنوں کی میہمانی، اب بھی ہوتی ہے

کوئی خوش ہو، مری مایوسیاں فریاد کرتی ہیں

الٰہی! کیا جہاں میں شادمانی، اب بھی ہوتی ہے

بتوں کو کر دیا تھا جس نے مجبورِ سخن اختر

لبوں پر وہ نوائے آسمانی اب بھی ہوتی ہے

○

کبھی کاش رحم کا بھی اثر ملے چشمِ فتنہ نگاہ میں

کہ کوئی گدا ہے پڑا ہوا ترے دردِ عشق کی راہ میں

نہیں عذر زاہدو، لاکھ مرتبہ جائیں طوفِ حرم کو ہم
مگر ایک شرط ہے میکدہ نہ ملا کرے ہمیں راہ میں

نہیں یاد عیش و ملالِ عمرِ گذشتہ کی کوئی داستاں
مگر آہ چند وہ ساعتیں جو بسر ہوئی ہیں گناہ میں

جو مزاجِ دل نہ بدل سکا تو مذاقِ دہر کا کیا گلہ
وہی تلخیاں ہیں ثواب میں، وہی لذتیں ہیں گناہ میں

گِلہ ستم کی مجال تو ہے، پر آہ اس کا میں کیا کروں
یہ جو ایک بجلی سی بے قرار ہے، ان کی نیچی نگاہ میں

مجھے انقلابِ زمانہ کا، جو یقین آئے تو کس طرح
وہی درد ہے مری آہ میں، وہی ناز تیری نگاہ میں

بخدا کہ دونوں جہان میں کوئی اس سے بڑھ کے خوشی نہ تھی
اگر ایک تلخیِ انفعال کی حس نہ ہوتی گناہ میں

○

نگہِ شوق ہے زبانِ خموش | عشقِ رسوا کی داستانِ خموش
خوابِ نوشیں میں ہے وہ جانِ بہار | نور و نکہت کی داستانِ خموش
آہ وہ جذبِ دل کی پہلی نگاہ | وہ محبت کی جیستانِ خموش
تم کو اختر کبھی یاد آتا ہے | کھویا کھویا سا وہ جوانِ خموش

○

نہ بھول کر بھی تمنّائے رنگ و بو کرتے
چمن کے پھول اگر تیری آرزو کرتے
جنابِ شیخ پہنچ جاتے، حوضِ کوثر تک
اگر شراب سے میخانے میں وضو کرتے
مسرّت آہ تُو بستی ہے کن ستاروں میں
زمیں پہ عمر ہوئی تیری جستجو کرتے
ایاغِ بادہ میں آکر وہ خود چھلک پڑتا
گر اس کے مست ذرا اور ہاؤ ہو کرتے
انھیں مفر نہ تھا اقرارِ عشق سے لیکن
حیا کو ضد تھی کہ وہ پاسِ آبرو کرتے
پکار اٹھتا وہ آکر دلوں کی دھڑکن میں
ہم اپنے سینے میں گر اس کی جستجو کرتے
غمِ زمانہ نے مجبور کر دیا ورنہ!
یہ آرزو تھی کہ بس تیری آرزو کرتے
گراں تھا ساقیِ دوراں پر ایک ساغر بھی
تو کس امید پہ ہم خواہشِ سبو کرتے

جنونِ عشق کی تاثیر تو یہ تھی اختؔر
کہ ہم نہیں وہ خود اظہارِ آرزو کرتے

○

اُن رس بھری آنکھوں میں حیا کھیل رہی ہے
دو زہر کے پیالوں پہ قضا کھیل رہی ہے
ہیں نرگس و گل کس لیے مسحورِ تماشا
گلشن میں کوئی شوخ ادا کھیل رہی ہے
اس بزم میں جائیں تو یہ کہتی ہیں ادائیں
کیوں آئے ہو، کیا سر پہ قضا کھیل رہی ہے
اس چشمِ سیہ مست پہ گیسو ہیں پریشاں
میخانے پہ گھنگھور گھٹا کھیل رہی ہے
بدمستی میں تم نے انھیں کیا کہہ دیا اختؔر
کیوں شوخ نگاہوں میں حیا کھیل رہی ہے

○

کس کو دیکھا ہے، یہ ہوا کیا ہے؟
دل دھڑکتا ہے ماجرا کیا ہے؟
اک محبّت تھی، مٹ چکی یارب!
تیری دنیا میں اب دھرا کیا ہے؟
دل میں لیتا ہے چٹکیاں کوئی
ہائے اس درد کی دوا کیا ہے؟

حُوریں نیکوں میں بٹ چکی ہوں گی
باغِ رضواں میں اب رکھا کیا ہے ؟
اس کے عہدِ شباب میں جینا
جینے والو! تمہیں ہوا کیا ہے ؟
اب دوا کیسی، ہے دعا کا وقت
تیرے بیمار میں رہا کیا ہے ؟

یاد آتا ہے لکھنؤ اخترؔ
خلد ہو آئیں تو بُرا کیا ہے ؟

○

اے صبا کون سے گلزار سے تو آتی ہے ؟
تجھ سے اس غنچہ دہن کی مجھے بُو آتی ہے
پاس، فطرت کو ہے کتنا مری مے نوشی کا
جو کلی آتی ہے وہ لے کے سبو آتی ہے
رنگ و بو کا پھر اٹھا صحنِ چمن سے طوفاں
پھر کوئی گلبدن و غالیہ مو آتی ہے
چاندنی رات کی تاثیر ہے یا نشّہ میں
مجھ کو ہر پھول سے اس شوخ کی بو آتی ہے

کچھ تو کہہ ہم سے کہاں آنکھ لڑی ہے اخترؔ
تیرے شعروں سے ہمیں عشق کی بو آتی ہے

○

بہار آئی ہے، مستانہ گھٹا کچھ اور کہتی ہے
مگر ان شوخ نظروں کی حیا کچھ اور کہتی ہے
رہائی کی خبر کس نے اڑائی صحنِ گلشن میں
اسیرانِ قفس سے تو صبا کچھ اور کہتی ہے
بہت خوش ہے دلِ ناداں ہوائے کوئے جاناں میں
مگر ہم سے زمانے کی ہوا کچھ اور کہتی ہے
تو میرے دل کی سُن آغوش بن کر کہہ رہا ہے کچھ
تری نیچی نظر تو جانے کیا کچھ اور کہتی ہے
مری جانب سے کہہ دینا صبا لاہور والوں سے
کہ اس موسم میں دہلی کی ہوا کچھ اور کہتی ہے
ہوئی مدت کہ مے نوشی سے توبہ کر چکے اختر
مگر دہلی کی مستانہ فضا کچھ اور کہتی ہے

○

وہ کبھی مل جائیں تو کیا کیجئے؟ رات دن صورت کو دیکھا کیجئے؟
چاندنی راتوں میں اک اک پھول کو بے خودی کہتی ہے سجدہ کیجئے؟
جو تمنا بر نہ آئے عمر بھر عمر بھر اس کی تمنا کیجئے؟

عشق کی رنگینیوں میں ڈوب کر — چاندنی راتوں میں رویا کیجیے
پوچھ بیٹھے ہیں ہمارا حال وہ — بے خودی تو ہی بتا کیا کیجیے
ہم ہی اس کے عشق کے قابل نہ تھے — کیوں کسی ظالم کا شکوہ کیجیے
آپ ہی نے دردِ دل بخشا ہمیں — آپ ہی اس کا مداوا کیجیے

کہتے ہیں اخترؔ وہ سن کر میرے شعر
اس طرح ہم کو نہ رسوا کیجیے

○

نہ چھیڑ زاہدِ ناداں شراب پینے دے
شراب پینے دے خانہ خراب پینے دے
ابھی سے اپنی نصیحت کا زہر دے نہ مجھے
ابھی تو پینے دے اور بے حساب پینے دے
میں جانتا ہوں چھلکتا ہوا گناہ ہے یہ
تو اس گناہ کو بے احتساب پینے دے
پھر ایسا وقت کہاں، ہم کہاں، شراب کہاں
طلسمِ دہر ہے نقشِ بر آب، پینے دے
مرے دماغ کی دُنیا کا آفتاب ہے یہ
ملا کے برف میں یہ آفتاب پینے دے

کسی حسینہ کے بوسوں کے قابل اب رہے
تو ان لبوں سے ہمیشہ شراب پینے دے
سمجھ کے اُس کو غفور الرحیم پیتا ہوں
نہ چھیڑ ذکرِ عذاب و ثواب پینے دے
جو رُوح ہو چکی اک بار داغدار مری
تو اور ہونے دے لیکن شراب پینے دے
شراب خانے میں یہ شورِ کیوں مچایا ہے
خموش اخترِ خانہ خراب پینے دے

○

اگر وہ اپنے حسین چہرے کو بھول کر بے نقاب کر دے
تو ذرّے کو ماہتاب اور ماہتاب کو آفتاب کر دے
تری محبّت کی وادیوں میں مری جوانی سے دور کیا ہے
جو سادہ پانی کو اک نشیلی نظر میں رنگیں شراب کر دے
حریمِ عشرت میں سونے والے، شمیمِ گیسو کی مستیوں سے
مری جوانی کی سادہ راتوں کو اب تو سرشارِ خواب کر دے
مزے وہ پائے ہیں آرزو میں کہ دل کی یہ آرزو ہے یارب
تمام دنیا کی آرزوئیں مرے لیے انتخاب کر دے

نظر نہ آنے پہ ہے یہ حالت کہ جنگ ہے شیخ و برہمن میں
خبر نہیں کیا سے کیا ہو دنیا جو خود کو وہ بے نقاب کر دے

مرے گناہوں کی شورشیں اس لیے زیادہ رہی ہیں یا رب
کہ ان کی گستاخیوں سے تو اپنے عفو کو بے حساب کر دے

خدا نہ لائے وہ دن کہ تیری سنہری نیندوں میں فرق آئے
مجھے تو یوں اپنے ہجر میں عمر بھر کو بیزارِ خواب کر دے

ہیں جان و دل سے تصورِ حسنِ دوست کی مستیوں کے قرباں
جو اک نظر میں کسی کے بے کیف آنسوؤں کو شراب کر دے

عروسِ فطرت کا ایک کھویا ہوا تبسم ہے جس کو اختر
کہیں وہ چاہے شراب کر دے کہیں وہ چاہے شباب کر دے

○

خیالستانِ ہستی میں اگر غم ہے خوشی بھی ہے
کبھی آنکھوں میں آنسو ہیں کبھی لب پر ہنسی بھی ہے

انہی غم کی گھٹاؤں سے خوشی کا چاند نکلے گا
اندھیری رات کے پردے میں دن کی روشنی بھی ہے

یونہی تکمیل ہوگی حشر تک تصویرِ ہستی کی
ہر اک تکمیل آخر میں پیامِ نیستی بھی ہے

یہ وہ ساغر ہے صہبائے خودی سے پُر نہیں ہوتا
ہمارے جامِ ہستی میں سرشکِ بے خودی بھی ہے

○

نہ وہ خزاں رہی باقی نہ وہ بہار رہی
رہی تو میری کہانی ہی یادگار رہی

وہی نظر ہے نظر جو بایں ہمہ پستی
ستارہ گیر رہی کہکشاں شکار رہی

شبِ بہار میں تاروں سے کھیلنے والے
کسی کی آنکھ بھی شب بھر ستارہ بار رہی

تمام عمر رہا گرچہ میں تہی پہلو
بسی ہوئی مرے پہلو میں بوئے یار رہی

کوئی عزیز نہ ٹھہرا ہمارے دفن کے بعد
رہی جو پاس تو شمعِ سرِ مزار رہی

وہ پھول ہوں جو کھلا ہو خزاں کے موسم میں
تمام عمر مجھے حسرتِ بہار رہی

کبھی نہ بھولیں گی اس شب کی لذتیں اخترؔ
کہ میرے سینے پہ وہ زلفِ مشکبار رہی

○

اے دل وہ عاشقی کے فسانے کدھر گئے؟
وہ عمر کیا ہوئی، وہ زمانے کدھر گئے؟
ویراں ہیں صحن و باغ بہاروں کو کیا ہوا؟
وہ بلبلیں کہاں وہ ترانے کدھر گئے؟

ہے نجد میں سکوت، ہواؤں کو کیا ہوا؟
لیلائیں ہیں خموش، دوانے کدھر گئے؟

اجڑے پڑے ہیں دشت، غزالوں پہ کیا بنی؟
سُونے ہیں کوہسار، دوانے کدھر گئے؟

وہ ہجر میں وصال کی اُمید کیا ہوئی؟
وہ رنج میں خوشی کے بہانے کدھر گئے؟

دن رات میکدے میں گزرتی تھی زندگی
اختر وہ بےخودی کے زمانے کدھر گئے

○

نہ تمہارا حُسنِ جواں رہا، نہ ہمارا عشقِ جواں رہا
نہ وہ تم رہے نہ وہ ہم رہے، جو رہا تو غم کا سماں رہا

نہ وہ باغ ہیں نہ گھٹائیں ہیں، نہ وہ پھول ہیں نہ فضائیں ہیں
نہ وہ نکہتیں نہ ہوائیں ہیں، نہ وہ بیخودی کا سماں رہا

نہ وہ دل ہے اب نہ جوانیاں، نہ وہ عاشقی کی کہانیاں
نہ وہ غم نہ اشک فشانیاں، نہ وہ دردِ دل کا نشاں رہا

نہ چمن ہے وہ نہ بہار ہے، نہ وہ بُلبلیں نہ ہزار ہے
یہی چار سمت پکار ہے، نہ وہ رت رہے، نہ سماں رہا

نہ وہ عمر ہے نہ مسرتیں، نہ وہ عیش ہے نہ وہ عشرتیں
نہ وہ آرزوئیں نہ حسرتیں، نہ خوشی کا نام ونشاں رہا
نہ نشاں ہے ساقی وجام کا، نہ وہ بادہ ہائے چمن ادا
نہ مغنیہ رہی محوِ ساز، نہ سازِ مستِ فغاں رہا
یہ بہارِ گلشنِ آب وگِل ہے فنا اثر تو ہوں کیوں خجل
وہ گُلِ فسردہ ہے میرا دل، کہ ہمیشہ نذرِ خزاں رہا
نہیں صبر ساقیا لا بھی دے، قدحِ بہار اٹھا بھی دے
ابھی سِن ہے لا کے پلا بھی دے کہ ہمیشہ کون جواں رہا
کہوں کیا کہ رنج رسیدہ ہوں، میں برنگِ ابر رمیدہ ہوں
نفسِ شمیم پریدہ ہوں کہ رہا تباہ جہاں رہا
اثرِ بہارِ خزاں اثر، ہے کہ ہے فسردہ مری نظر
نہ ہوائے عشرتِ بال وپر، نہ جنونِ باغِ جناں رہا
میں گلِ رمیدۂ رنگ وبو، تو بہارِ میکدۂ نمو
میں ہمیشہ خستۂ آرزو، تو ہمیشہ عیشِ جواں رہا
نہ سکونِ دل نہ قرارِ جاں، نہ قیامِ صبر کوئی زماں
یہ سرشکِ غم کا ہے کارواں کہ یونہی ہمیشہ رواں رہا

تو متاعِ گلکدۂ نظر، گلِ نو بہارِ بہشت اثر
ہیں وہ عندلیبِ شکستہ پر، کہ ہمیشہ محوِ فغاں رہا
نہ وہ سوز و سازِ دروں ہے اب، وہ چشمِ گلکدہ گوں ہے اب
نہ وہ سر ہے اب نہ جنوں ہے اب، نہ وہ ذوقِ شعلہ چکاں رہا،
ہے فلک کی بدلی ہوئی نظر، کہیں کس سے اخترِ نالہ گر
کہ میں اس کے جورِ الم اثر سے ہمیشہ محوِ فغاں رہا

○

آشنا ہو کر تغافل آشنا کیوں ہو گئے؟
باوفا تھے تم، تو آخر بے وفا کیوں ہو گئے؟
اور بھی رہتے ابھی کچھ دن نظر کے سامنے
دیکھتے ہی دیکھتے ہم سے خفا کیوں ہو گئے؟
ان وفاداری کے وعدوں کو الٰہی کیا ہوا؟
وہ وفائیں کرنے والے، بے وفا کیوں ہو گئے؟
کس طرح دل سے بھلا بیٹھے ہماری یاد کو
اس طرح پردیس جا کر بے وفا کیوں ہو گئے؟
تم تو کہتے تھے کہ ہم تجھ کو نہ بھولیں گے کبھی
بھول کر ہم کو تغافل آشنا کیوں ہو گئے؟

ہم تمہارا دردِ دل سُن سُن کے ہنستے تھے کبھی
آج روتے ہیں کہ یوں درد آشنا کیوں ہو گئے؟
چاند کے ٹکڑے بھی نظروں میں سما سکتے نہیں
کیا بتائیں ہم ترے در کے گدا کیوں ہو گئے؟
یہ جوانی، یہ گھٹائیں، یہ ہوائیں، یہ بہار
حضرتِ اختؔر ابھی سے پارسا کیوں ہو گئے؟

○

نہ سازِ مطرب، نہ جام و ساقی، نہ وہ بہارِ چمن ہے باقی
نگاہِ شمعِ سحر کے پردے پہ نقشۂ انجمن ہے باقی
زمانہ گزرا وہ یاسمن بُو، جدا ہوئی ہم کنار ہو کر
مگر ابھی تک ہمارے پہلو میں نکہتِ یاسمن ہے باقی
بھلا چکی دل سے شامِ غربت ہر ایک نقشہ ہر ایک صورت
ہماری آنکھوں میں لیکن اب تک فروغِ صبحِ وطن ہے باقی
زمانہ بدلا، مٹی جوانی، نہ وہ محبّت، نہ زندگانی
بس ایک بھولی سی یاد ہے جو بہ رنگِ داغِ کہن ہے باقی
مٹا دیئے بے ستونِ چرخِ کہن نے شیریں لقا ہزاروں
مگر محبّت کے لب پہ اب بھی ترانۂ کوہکن ہے باقی

حباب آسا، محیطِ ہستی میں جو ہے مٹنے کو بن رہا ہے
ہے انقلاب اک نمود ایسی جو زیرِ چرخِ کہن ہے باقی
غمِ زمانہ کی سختیوں سے ہوئی ہے پامال طبعِ اختر
نہ وہ نشاطِ کہن ہے باقی، نہ وہ مذاقِ سخن ہے باقی

○

غم خانۂ ہستی میں ہیں مہماں کوئی دن اور
کر لے ہمیں تقدیر پریشاں کوئی دن اور
مر جائیں گے جب ہم تو بہت یاد کرے گی
جی بھر کے ستا لے شبِ ہجراں کوئی دن اور
تربت وہ جگہ ہے کہ جہاں غم ہے نہ حیرت
حیرت کدۂ غم میں ہیں حیراں کوئی دن اور
یاروں سے گلہ ہے نہ عزیزوں سے شکایت
تقدیر میں ہے حسرت و حرماں کوئی دن اور
پامالِ خزاں ہونے کو ہیں مست بہاریں
ہے سیرِ گل و حسنِ گلستاں کوئی دن اور
ہم سا نہ ملے گا کوئی غم دوست جہاں میں
تڑپا لے غمِ گردشِ دوراں کوئی دن اور

قبروں کی جو راتیں ہیں وہ قبروں ہی کٹیں گی
آباد ہیں یہ زندہ شبستاں کوئی دن اور

رنگینی و نزہت پہ نہ مغرور رہو بلبل
ہے رنگِ بہارِ چمنستاں کوئی دن اور

آخر کو وہی ہم، وہی ظلماتِ شبِ غم
ہے نورِ رُخِ ماہِ درخشاں کوئی دن اور

آزاد ہوں عالم سے، تو آزاد ہوں غم سے
دنیا ہے ہمارے لیے زنداں کوئی دن اور

ہستی کبھی قدرت کا اک احسان تھی ہم پر
اب ہم پہ ہے قدرت کا یہ احساں کوئی دن اور

لعنت تھی گناہوں کی ندامت مرے حق میں
ہے شکر کہ اس سے ہیں پشیماں کوئی دن اور

شیون کو کوئی خلدِ بریں میں یہ خبر دے
دنیا میں اب اخترؔ بھی ہے مہماں کوئی دن اور

رباعیات

(۱)

عید آئی ہے عیش و نوش کا ساماں کر
اک ساقیِ گلعذار کو مہماں کر
قربانی ہے واجب آج اختر تو بھی
توبہ کو خدا کے نام پر قرباں کر

(۲)

میخانہ بدوش ہیں گھٹائیں ساقی
پیمانہ فروش ہیں فضائیں ساقی
اک جام پلا کے مست کر دے مجھ کو
غارت گرِ ہوش ہیں ہوائیں ساقی

(۳)

رندوں کو بہشت کی خبر دے ساقی
اک جام پلا کے مست کر دے ساقی
پیمانۂ عمر ہے چھلکنے کے قریب
بھر دے ساقی، شراب بھر دے ساقی

(۴)

جنّت کا سماں دکھا دیا ہے مجھ کو
کونین کا غم بھلا دیا ہے مجھ کو
کچھ ہوش نہیں کہ ہوں میں کس عالم میں
ساقی نے یہ کیا پلا دیا ہے مجھ کو

متفرقات

میکدے میں اب بھی فخر کرآتا ہے مے نوشی کے وقت
کیا خبر تھی اختر اتنا پارسا ہو جائے گا

میری تنہائی کی توہین ہوتی یارب
کوئی آنسو مری آنکھوں کا سہارا ہوتا

ہو گئی بزم میکدہ خاموش